ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر

لافانی قلم سے

ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر ایم اے

ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر

قیمت -/۲۰ روپے

یکے از مطبوعات

بک کارنر چوک فیصل شہید جہلم

فون ۲۸۸۵

اس ناول کا مرکزی کردار ایک حسین خانہ بدوش لڑکی لاچی ہے
جس کا قبیلہ آج اس بیسویں صدی میں بھی ہزاروں برس پرانی
زندگی کی ڈگر پر چل رہا ہے بمبئی کے مضافاتی اسٹیشنوں کے
اردگرد ایسے خانہ بدوش قبیلے آتے جاتے رہتے ہیں اور اپنی
عجیب اور دلچسپ زندگی سے کچھ دنوں کے لئے فضا کو رنگین
بنا جاتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے ہی خانہ بدوش قبیلے اور
اس قبیلے کی ایک بہادر لڑکی کی داستان ہے جو ہر قدم
پر زندگی کی عظمت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ایک ہنگامہ تھا.
قلی، کلسیان کی گاڑی پکڑنے والے مسافر، ٹکٹ چیکر
اسٹیشن کے باہر پھل بیچنے والا مادھو، یارڈ میں گشت کرنیوالے
سنتری، جھاڑو پھیرنے والا جمعدار بھی موجود تھے اور لاچی کیطرف
دیکھ دیکھ کے ہنس رہے تھے.
اور لاچی سب سے الگ تھلگ اسٹیشن ماسٹر کی
میز کے سامنے اپنے دونوں کولھوں پر بڑی بے شرمی اور
بے حیائی سے اپنے دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اس کے

چہرے پر ایسا غصہ تھا جیسے ابھی سب کو کچا کھا جائے گی۔
مگر اس وقت وہ دشمنوں کے نرغے میں بے بس کھڑی تھی —

اور اسٹیشن کے لوگ جو اُسے اچھی طرح جانتے تھے اس کی طرف دیکھ دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو اشاروں ہی اشاروں میں کچھ سمجھا رہے تھے۔

یارڈ سنتری جب لاچی کو لئے پہلے پہل اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لاچی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ مگر اسٹیشن ماسٹر کے سامنے آتے ہی لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر بڑی بے غیرتی سے کھڑی ہوگئی۔

رسک لال اسٹیشن ماسٹر کو کسی طرح کا ہنگامہ قطعی پسند نہ تھا۔ وہ بیوی بچوں والا امن پسند اور سکون طلب گجراتی تھا۔ پچیس سال اسے ریلوے کی سروس کرتے ہوگئے تھے۔

اس کا بڑا لڑکا ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہونے والا تھا۔ اور اس سے چھوٹی لڑکی وملا اب کالج میں پڑھتی تھی جس کے لئے بر ڈھونڈنے میں اُسے بڑی پریشانی ہورہی تھی پھر

دن بھر سٹیشن چلانے اور خوش اسلوبی سے چلانے کی ذمہ داری تھی اور ابھی وہ گنگا دین بھیّا گھاس والے سے اسٹیشن ویگنوں کا معاملہ طے کر رہا تھا۔ جس سے اُسے پانچ سو روپے کے قریب ملنے کی امید تھی کہ بیچ میں یہ ہنگامہ ٹپک پڑا۔

رسک لال نے اپنے دبلے پتلے چہرے کی ٹھوڑی کے ٹھنٹھ کو کھجاتے ہوئے بھرے بھرے بدن والی لاچی کو دیکھا پھر یارڈ سنتری کو دیکھا اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ تیز اور تلخ لہجے میں بولا۔

" کیا ہے ؟ "

یارڈ سنتری نے لاچی کو ہاتھ لگا کر کہا۔

" اِس نے یارڈ سے کوئلہ چرایا ہے۔ "

لاچی نے اس کا ہاتھ پھر زور سے جھٹک کر کہا۔

" مجھے ہاتھ مت لگا، دور سے بات کر۔ "

مجمع میں ہنسی اور مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مادھو پھل والا خوشی سے چیخ کر بولا۔

" ابے کاٹ کھائے گی سنتری! بھڑوں کی رانی ہے بیٹا۔ "

"تو چپ رہ کچے پپیتے۔"
لاجی مادھو کیطرف دیکھ کر بولی

مادھو پھل والا میانے قد کا، گدرائے ہوئے بدن کا تھا۔ وہ اپنی کمر پر صرف ایک میلی کچیلی چھوٹی سی دھوتی باندھے رکھتا تھا۔ جو بمشکل اس کے گھٹنوں تک آتی تھی۔ دھڑ کے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے وہ بالکل ننگا رہتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ اس کے جسم پر کہیں ایک بال بھی نظر نہ آتا تھا۔ اور اس کے سانولے رنگ میں ایک ایسی سبزی مائل چمک تھی کہ جب لاجی نے اُسے کچا پپیتا کہا تو یہ پھبتی اس پر بالکل چپک کر رہ گئی۔

اور مجمع پھر بے اختیار ہنسنے لگا۔

بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس لئے اسٹیشن ماسٹر نے جلدی جلدی لاجی سے پوچھا۔

"تو نے پپیتا چرایا ہے؟"

"پیپتا نہیں، کوئلہ چرایا ہے!"

لاچی بے اختیار ہنس کر بولی

اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف انگلی اٹھا کر مجمع کی طرف داد طلب نگاہوں سے جیسے کہنے لگی۔

"دیکھ لو، ایک احمق یہ بھی ہے۔"

رسک لال نے گھبرا کر کوئلے کی جگہ پپیتا کہہ تو دیا مگر اب مجمع کو ہنستا دیکھ کر خود اس کی ہنسی بھی رُک نہ سکی۔ غصے میں بھرا ہوا یارڈ سنتری بھی ہنس پڑا۔

رسک لال نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکاتے ہوئے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔

"جانے دو یارڈ سنتری! اس وقت ٹن ڈاؤن کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور تم یہ جھگڑا لے آئے۔"

پھر رسک لال نے گھبرا کر لاچی کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا

"جاؤ، لیکن پھر کبھی اسٹیشن یارڈ سے کوئلہ نہ چرانا۔ ورنہ جیل میں بھیج دوں گا۔"

"اچھا۔!"

لاچی نے اسٹیشن ماسٹر کی میز سے مڑتے ہوئے اس طرح کہا۔ جیسے وہ اسٹیشن ماسٹر ہی پر نہیں سارے مجمع پر احسان کر رہی ہو۔ اور نیلی چھینٹ کے پھولدار گھاگرے کو جھلاتی ہوئی ننگے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکل کر وہ نمبر ایک پلیٹ فارم پر آگئی۔ اور تیز تیز قدموں سے باہر کے گیٹ کی طرف جانے لگی۔

لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ اکثر لوگ اس کی طرف دیکھتے تھے۔ مرد حسرت سے دیکھتے تھے۔ عورتیں رشک سے،

لاچی، خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی، جانے کتنی نسلوں، قوموں، رنگوں کے باہم امتزاج کے بعد حسن کا یہ نادر نمونہ تیار ہوا تھا۔ اونچا پورا قد، سنہرا گندمی رنگ، گہری سبز آنکھیں، سینے میں کمان کا سا خم اور تناؤ، اور کمر میں تیر کی سی سبک اندازی لیے جب لاچی چلتی تھی تو اس کامل اعتماد سے جیسے ساری دنیا اُسے جھک کر سلام کر رہی ہو

"ایسی عورتوں کو واقعی جیل بھیج دینا چاہیے۔"

حمیدے ٹیکسی ڈرائیور نے لاچی کو گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

حمید ٹیکسی ڈرائیوروں کا سرغنہ تھا اور اسٹیشن کے آس پاس کے علاقے کا دادا سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں شراب چرس، افیون اور لڑکیوں کا دھندا اسی کی معرفت ہوا کرتا تھا وہ کالا، ناٹا، گٹھے ہوئے بدن کا انتہائی پھرتیلا نوجوان تھا۔ اور اپنے زعم میں بہت کچھ تھا۔ اور جو اسے بہت کچھ نہیں سمجھتا تھا وہ اسے ٹھیک کر دیتا تھا۔ خود رسک لال اسٹیشن ماسٹر اس سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ طرح دیتا تھا۔

مگر لاچی حمیدے سے بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ اس نے جب حمیدے کا یہ فقرہ سنا تو اس نے جواب میں زور سے حمیدے کیطرف تھوک دیا۔ اور کمر کو جھلاتی ہوئی اور پیٹھ کھجاتی ہوئی اپنی کالی چولی کی باہیں ٹھیک کرتی ہوئی آگے کے بس اسٹینڈ کی طرف بھیک مانگنے کیلئے بڑھ گئی۔ کیونکہ اس وقت پوری دلی لوکل پلیٹ فارم نمبر دو پر آچکی تھی۔ اور لوگ گیٹ سے بھاگتے ہوئے بس اسٹینڈ پر کیو لگانے کیلئے کھڑے ہو رہے تھے۔

حمیدے کو لاچی کے تھوکنے پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ دو تین بار اس نے ڈرا دھمکا کے لاچی کو اپنے رعب میں لانا چاہا مگر ہر بار منہ کی کھائی تھی۔ اُسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ لاچی کا بدن بے حد مضبوط ہے اور اُسے خانہ بدوشوں اور نٹنیوں کے گر ایسے یاد ہیں جن کی مدد سے وہ کسی بھی وقت کسی مرد کو پٹخنی دے سکتی ہے۔

لاچی عام شہری یا دیہاتی عورتوں کیطرح نہیں تھی۔ جو مرد کا ایک گھونسہ کھاتے ہی چٹائی کیطرح بچھ جاتی ہیں۔ حمیدا لاچی کو چھیڑنے کا عملی تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے اب تھوکنے پر بھی کھسیا کے ہنس دیا تھا اور منہ پھیر کر اپنی ٹیکسی کیطرف چلا گیا

لاچی نے چلتے چلتے مادھو کی دکان سے ایک امرود اٹھالیا اور اپنے بیحد سفید اور متناسب دانت اس میں گڑ دیئے۔ اور اسے ایک گلہری کیطرح کھانے لگی۔ وہ امرود کھاتی جاتی تھی اور شریر نگاہوں سے مادھو کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ جو بالکل مبہوت ہوکر لاچی کے چہرے کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے لوہا مقناطیس کو دیکھتا، اگر وہ دیکھ سکتا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مادھو اس وقت کیا دیکھ رہا تھا۔

اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کیسی گرسنہ بے بسی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے گیلے ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا کئے۔

" امرودوں کا پورا ٹوکرا لے جاؤ نا !"

" ہُشت !"

لاچی نے آدھا کھایا ہوا امرود اس کے منہ پر دے مارا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

جب وہ مادھو کی دکان کے چھجے سے باہر گئی اسی وقت ڈوبتے سورج نے اس کے بکھرے بکھرے گھنیرے سرخ بالوں کو چھولیا۔ اور لاچی کے سر کے گرد شعلوں کا ایک لپکتا ہوا، تڑپتا ہوا ہالہ سا بن گیا۔ اور غریب مادھو نے اسے دیکھ کر بے اختیار کہا۔

" معلوم ہوتا ہے بیری کے جھاڑ کو آگ لگی ہے۔"

پھر وہ چپکے سے لاچی کا جھوٹا امرود کھانے لگا اور لاچی کو دکھا دکھا کے کھانے لگا۔

" تیرا جھوٹا کھا رہا ہوں لاچی۔"

لاچی نے چلتے چلتے مڑ کر وار کیا۔

" میرا تھوکا ہوا ——— !"

اب لاچی بس اسٹینڈ کے کیو تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے

ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنا شروع کیا۔

"عینک والے بابو ایک آنہ۔"

"چھاتے والی بی بی ایک آنہ۔"

"بنڈل والے سردار جی ایک آنہ۔"

جیسے وہ بھیک نہ مانگ رہی ہو۔ کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو نیلام کر رہی ہو۔

"سارا مال لٹا دیا ایک آنے میں۔"

ایک بابو نے اس کی جانب آنکھ مار کے کہا۔

"بارہ آنے دوں گا۔!"

"اپنی ماں کو دے۔!"

تڑاخ سے لاچی نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

۲

اس دنیا میں بڑی مشکل ہے لیکن خانہ بدوشوں کیلئے تو یہاں اور بھی مشکل ہے۔ کھیتوں میں اُگے ہوئے پودوں کیطرح جو لوگ ایک ہی شہر یا گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو

پہچانتے ہیں۔ خوشی کی ہوا میں ایک ساتھ لہلہا کر سرسراتے ہیں گیت گاتے ہیں اور اونچے ہو جاتے ہیں۔ بھوک کے پالے میں ایک ساتھ ٹھٹھرتے ہیں۔ اور بیماری کی وبا میں ایک ساتھ گر کر کٹ جاتے ہیں۔

لیکن خانہ بدوشوں کیلئے ہر جگہ مشکل ہے۔ وہ ہر کھیت کے کنارے اجنبی ہیں اور ہر گاؤں کی حد میں انجانے شہر کی گلی کا ہر موڑ ان کیلئے ایک نیا خطرہ ہے اور ہر چوراہے کا ہر سنتری انھیں ہر وقت بے دخل کر سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ اکیلے ہیں۔ یہ لوگ جو کسی قوم کسی مذہب، کسی رنگ اور کسی ملک کے نہیں ہیں۔ یا شاید یہ سب کے ہیں اس لئے کسی کے نہیں ہیں ان کے رنگ میں سب کا رنگ ہے۔ ان کے خون میں سب کا خون ہے اور ان کی زبان میں سب کے زبانیں ہیں۔ یہ لوگ جو اپنا خیمہ اپنی چٹائی، گھاس کے چند تنکے لئے گھومتے ہیں کس آشیانے کی تلاش میں ہیں ؟ — اپنی اس کاوش کا انجام انھیں خود معلوم نہیں۔ — !

ؔ

لاچی اپنے قبیلے میں اپنے چاچا مامن کے پاس رہتی تھی۔ کیونکہ چاچا مامن کے پاس اس کی ماں رہتی تھی۔ اور اس کی ماں چاچا مامن کے پاس اس لئے رہتی تھی کہ اس کا شوہر رگی

ایک بار شراب پی کر اسے جوئے میں ہار گیا تھا۔ ان دنوں لاچی صرف چار سال کی تھی۔ اس لئے جب ماں کیساتھ بیٹی بھی آ گئی تو ماتن بہت خوش ہوا۔ کیونکہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کماتی ہیں۔ مرد دن میں چار آنے کی ایک ٹوکری تیار کرتے ہیں۔ یا تین دن میں نو آنے کی چٹائی بُن لیتے ہیں۔

لیکن عورتیں آرٹ سلک کے گھیرے دار گھاگرے پہنے ریشم کی چولی چمکائے، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ نگاہوں میں دعوتِ نظارہ لئے گلی کوچوں کے موڑ پر بیٹھتی ہیں۔ اور عینکیں بیچتی ہیں، جڑی بوٹیاں بیچتی ہیں۔

گلٹ کی انگوٹھیاں، چھلے، آویزے، نگینے، کانچ کے ہار بیچتی ہیں اور خوب کماتی ہیں۔ ورنہ یہ خوبصورت کپڑے، یہ اونچی ایڑی کے جوتے، یہ کھائے پیئے شاداب جسم کہاں سے آتے ہیں۔ کسی فیکٹری سے ڈھل کر تو نہیں آتے۔

اس کے علاوہ خانہ بدوشوں کی بہت سی جوان عورتیں پُرانا دھندہ بھی کرتی تھیں۔

لاچی کے اپنے قبیلے میں روشنی، جاماں، لیپی، سنیاں یہی کرتی تھیں۔

شام ہوتے ہوتے آہنین یارڈ کے مغربی کنارے پر جہاں خانہ بدوشوں کے خیمے تھے۔ وہاں پر کئی موٹریں آکر کھڑی ہو جاتی تھیں کیونکہ شہر میں ایسی اچھی اور مقابلتاً سستی چیزیں کہاں سے مل سکیں گی۔ اور ہر بیوپاری وہی مال خریدنا چاہتا ہے جو اچھا ہو اور نسبتاً سستا ہو۔

تم لوگ امیر آدمی کی رات کو کیا سمجھتے ہو۔ دن بھر کتنے دھوکوں، جھوٹے وعدوں، چھینا جھپٹیوں اور آبلہ فریبیوں کے بعد صبح سے شام تک ضمیر کا خون کرنے کے بعد تو یہ رات آتی ہے۔ اس رات میں بھی اگر وہسکی کی نئی بوتل نہ ملے، تو لعنت ہے اس کام کرنے پر، پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے تو ہر احمق کام کرتا ہے۔

٭

اِس لئے جب رات آتی ہے تو ہر خانہ بدوش قبیلے کے ڈیرے پر تہذیب چمکتی ہوئی کاریں لیکر آتی ہے اور کھلی ہواؤں میں پلے ہوئے شاداب جنگلی پھولوں کو چن کر لے جاتی ہے۔ بیسویں صدی، پہلی صدی سے ملتی ہے۔

اور اس تہذیب کے ارتقاء میں اس نے جو

کھویا ہے اُسے پانے کی سعی کرتی ہے اور جو پایا ہے اُسے۔
کھونے کی سرشاری میں رات گزار دیتی ہے۔

اور

جب رات گزر جاتی ہے تو کاریں اپنے آفس
چلی جاتی ہیں۔ اور غریب خانہ بدوش لڑکیاں فٹ پاتھ پر
مجمع لگا کر عینکیں بیچتی ہیں ....

ہے کوئی جو عینک لگا کر دیکھے ؟

شام ڈھل کر رات میں گم ہو رہی تھی۔ جب لاچی اپنے خیمے میں واپس آئی۔ خانہ بدوشوں کے خیمے اسٹیشن یارڈ کے مغربی جانب تھے یہاں گھاس کا ٹیڑھا میڑھا، بیچ بیچ پتھروں سے اٹا ہوا ایک کشادہ قطعہ تھا جس کے شمال میں گل مہر کے پیڑوں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ 2 3

غربی کنارے پر پتھر کے کوئلے کا ایک شیڈ تھا۔ اور بہت سا کوئلہ ترپال سے ڈھکا ہوا شیڈ سے باہر بھی پڑا تھا۔ جنوب میں گنگا دین بھیا گھاس والے کی گھاس کے سینکڑوں گٹھے ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ مشرقی جانب ایک پرانا تالاب تھا جس کے پرے وکٹر کانٹے والے کا کوارٹر تھا۔

گل مہر کے پیڑوں کی قطاروں سے پرے موٹر روڈ تھی جو ہوائی اڈے کو جاتی تھی۔ ہوائی اڈے سے پرے شمالی پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا جن کی چوٹیوں پر ہوائی جہاز کو خبردار کرنے کیلئے رات میں لال لال روشنیاں جگمگاتی تھیں۔

لاچی جب ریلوے یارڈ کا جنگلا اُلانگھ کر جوہڑ کے کنارے کنارے چلتی ہوئی ایک ٹیلے کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا اس کا باپ رگی ٹیلے پر بیٹھا پتھروں سے کھیل رہا ہے۔

رگی کی پیٹھ لاچی کیطرف تھی لیکن لاچی کو معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ وہ اس کے قریب سے ہو کر جانے لگی تو رگی نے خاموشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ایک عرصے سے رگی کا یہ دستور تھا کہ وہ شام ڈھلے ٹیلے پر پہنچ جاتا اور اپنی بیٹی کا انتظار کرتا اور جب لاچی اس کے سامنے سے ہو کر جانے لگتی تو دستِ سوال آگے بڑھا دیتا۔

لاچی نے جیب ٹٹولی اور اس میں سے چار آنے نکال کے رگی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ باپ بیٹی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جس دن سے رگی اپنی بیوی اور بیٹی کو جوئے میں ہار گیا تھا۔ اس دن سے بیٹی کو بھی اس سے نفرت ہو گئی تھی۔

رگی بے حد نکما اور کاہل تھا۔ یوں وہ دف بجانے، ناچنے گانے اور شراب پینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کی آواز بڑی پاٹ دار اور سریلی تھی اور وہ ٹوکریاں بھی بہت اچھی بناتا تھا لیکن کام کرنے سے جیسے اُسے نفرت تھی۔

خانہ بدوشوں میں اس کے کپڑے سب سے زیادہ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے ہوتے تھے۔ ان میلے چیکٹ کپڑوں میں اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کے اوپر تانبا رنگ رخسار ہر وقت ایک عجیب شرارت سے چمکتے تھے۔

چونی لیکر اس نے اپنی پرانی واسکٹ میں ڈال لی۔ اور پھر پتھروں سے کھیلنے لگا۔

کئی بار لاچی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کو ریزگاری دینے کی بجائے اس کے شرارت بھرے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دے۔ لیکن ہر بار جانے کون سا جذبہ تھا جو اس کا ہاتھ روک لیتا تھا اور وہ مجبور ہو جاتی تھی۔ کہ اپنے باپ کے کالے گھنے بالوں والے ہاتھ کی ہتھیلی پر چار آٹھ آنے رکھ دے۔

ہاں آگے بڑھ کر اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ اس کے تھپڑ کیوں نہیں مار سکتی اس دنیا میں ہر جذبہ اپنا تاوان کیوں وصول کر لیتا ہے

اس نے ایک چھوٹے سے پتھر کو اپنے ننگے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری اور لڑھکتے ہوئے پتھر کے پیچ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے خیمے تک پہنچ گئی۔ خیمے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ خیمے کے باہر ایک چٹائی بچھا کر اس کا چچا ماہن اور قبیلے کا سردار دمارو مٹی کے پیالے میں ٹھرا پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔

لاچی کی ماں ماہن کے کندھے سے لگی تاش کے پتوں کو دیکھتی ہوئی اپنے خاوند کو مشورہ دیتی جاتی تھی اور کبھی کبھی ماہن کا پیالہ اٹھا کر اس میں سے ایک گھونٹ پی لیتی تھی۔

لیکن خاوند بیوی دونوں کی کوشش کے باوجود ماہن ہار رہا تھا۔ اور سیاہ رنگ، لمبوتری ناک والے دمارو سردار کے چہرے پر فتح مندی کی ابلیسانہ چمک تھی۔

لاچی کے پاؤں کی آہٹ پا کر تینوں نے مڑ کر لاچی کیطرف دیکھا دمارو کے چہرے پر ایک عجیب حریصانہ چمک نمودار ہوئی۔ ماہن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

اور ماہن کی بیوی نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر اپنی جھولی لاچی کیطرف پھیلا دی۔

لاچی نے اپنی جیب سے ساری ریزگاری نکال کے اپنی

ماں کی جھولی میں ڈال دی۔ اور پکتی ہوئی خیمے کے اندر چلی گئی۔

"مجھے دیدے کولی۔"

مامن نے ہاتھ آگے بڑھا کے اپنی بیوی سے کہا۔

"ٹھہر تو کمبخت، گن یہ لینے دے۔"

کولی گنتے گنتے بولی۔

"گن کر کیا کرے گی؟" مامن نفرت سے بولا۔ "ہونگے پندرہ بیس آنے، جن میں سے چار چھ آنے وہ تیرے پہلے خصم کو دے آئی ہوگی۔"

"اور تم جو یہ جوا کھیل رہے ہو، یہ شراب پی رہے ہو، یہ مچھلی کھا رہے ہو، یہ کس کی محنت کی کمائی ہے؟"

یکایک کولی غصے سے اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔

مامن کی بیوی نے بالکل ٹھیک طعنہ دیا تھا۔ وہ ادھیڑ ہو گئی تھی پھر بھی اتنی خوبصورت تھی کہ اگر دل لگا کر شکار کرتی تو آٹھ دس روپے اینٹھنا اس کیلئے کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن اب اس کا جی نہ چاہتا تھا۔

جب گھر میں جوان بیٹی موجود ہو تو کس ماں کا جی خود دھندہ کرنے کو چاہے گا؟ سوچنے کی بات ہے کس انسان کا دل آرام کرنے کو نہیں چاہتا۔ لیکن آج مامن کا جی پینے اور جوا کھیلنے کو بری طرح چاہ رہا تھا۔

اور اس نے لاچی کی ماں کو مجبور کردیا تھا کہ آج وہ اس کیلئے کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر دے اور یہ تو دونوں کو معلوم تھا کہ لاچی مرتے مرتے مر جائے گی لیکن یہ بندوبست نہ کرے گی۔

اس کیلئے بیچاری غریب ماں ہی کو سب کچھ کرنا پڑا۔ اِس لئے ٹھرا پیتے پیتے لاچی کی ماں کو بھی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زہر کا گھونٹ پی رہی ہو۔ اُسے لاچی پر بیحد غصہ آتا تھا۔ لیکن وہ مامن کی بات بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

مامن یہ سن کر چُپ تو ہو گیا لیکن اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس آگ پر تیل چھڑکتے ہوئے دمارو نے کہا

"جوان عورت تو سونے کی کان ہوتی ہے اور پھر لاچی ایسی خوبصورت لڑکی۔ !"

لاچی نے فوراً کہا۔

"تم مجھے کوئلوں کی کان سمجھ لو یا پتھر کی کان، لیکن میں دھندہ نہیں کروں گی۔"

"تم بیچ میں مت بولو۔"

مامن کی بیوی نے لاچی سے سختی سے کہا

"جاؤ مچھلیاں تل کے لاؤ۔"

لاچی خیمے کے ایک طرف مچھلیاں تلنے لگی۔ آگ کے شعلوں کی روشنی میں وہ اور بھی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ دمارو سردار نظر بچا کر بار بار اس کیطرف دیکھ لیتا تھا۔ آج دمارو سردار بہت خوش تھا۔ وہ برابر جیت رہا تھا۔

بہت رات گئے جب ٹھرا ختم ہوگیا اور لاچی کی آنکھوں میں نیند آنے لگی اور دیئے کی لَو بجھنے لگی۔ تو ان لوگوں نے بازی اُٹھا دی۔ مامن کی بیوی نے جب حساب کیا تو مامن پچاس روپے ہار چکا تھا۔

مامن نے اپنی جیب ٹٹولی۔

اس میں سے صرف دس آنے کے پیسے نکلے۔

"دس آنے کم پچاس۔!"

دمارو نے سختی سے کہا اور ہاتھ پھیلا دیئے۔

"لاؤ۔"

مامن کی بیوی اُٹھ کے خیمے کے اندر چلی گئی۔ اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تین روپے تھے۔

"تین روپے دس آنے کم پچاس۔"

دمارو پھر چلایا۔

"میرا دف لے لو۔ جھانجھ لے لو۔" ماحن کی بیوی بولی

دمارو حقارت سے ہنسا

"میرا خنجر لے لو جس پر چاندی کی ہتھی ہے۔"

دمارو شرارت سے ہنسا اور بولا۔

"میں تو سونے کے بالوں والی لاچی لوں گا۔"

"صرف پچاس روپے میں؟ ناممکن۔" ماحن نے سر ہلا کر کہا۔

دمارو نے جیب سے پچاس روپے اور نکالے اور بولا۔

"وہ پچاس روپے تمہیں معاف کئے۔ پچاس اور دیئے اب بولو؟"

سو روپے بہت ہوتے ہیں۔ ماحن کا جی للچایا۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ماحن نے دمارو کو دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیا۔

"ایک سو پچاس روپے۔"

دمارو نے پچاس اور بڑھا دیئے۔

دو سو روپے اب ماحن کے سامنے پڑے تھے۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں بیتاب ہونے لگیں۔ اس نے بہت بے چینی اور مضطرب

نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیکن اس کی بیوی نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

"ڈھائی سو!" دمارو غصے میں چلّایا۔ آج تو میں لاچی کو لے کر ہی جاؤں گا۔"

ڈھائی سو کی رقم دیکھ کر ماہن سے نہ رہا گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا لیکن اس کی بیوی نے پھر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

دمارو نے جیب ٹٹول کر سو کا آخری نوٹ نکالا۔ سو کا ہرا نوٹ دیکھ کر ماہن اور اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دمارو اس کے قبیلے کا سردار تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا اتنا امیر ہے۔ وہ تو بظاہر بالکل انھیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

ماہن کی بیوی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ماہن نے ساڑھے تین سو کے نوٹ اٹھا کے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لئے۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا۔

"ٹھہرو — !"

گھوم کر دیکھا تو لاچی کا باپ رگی کھڑا تھا۔ اس کے تانبا رنگ رخساروں پر ایک معنی خیز شرارت جھلک رہی تھی۔

اپنی طرف سب کو متوجہ دیکھ کر بولا۔

" سودا تو اچھا ہوا ہے کولی ۔" رگی نے طنز آمیز نگاہوں سے اپنی پہلی بیوی کیطرف دیکھ کر کہا ۔ " باپ اپنی بیوی کو ستر روپے میں ہار گیا ۔ بیوی نے اپنی بیٹی کے ساڑھے تین سو روپے وصول کر لئے ۔"

" پھر ـــــ ؟ "
ماہن کی بیوی زور سے چلّائی ۔
اس کی آواز میں ایک خطرناک چیلنج تھا ۔
رگی نے بڑی نرمی سے کہا ۔
" میں لاچی کا باپ ہوں ۔ ٹھیک ہے میں نے اس کی پرورش نہیں کی مگر اس کی رگوں میں خون تو میرا ہے ۔"
" کون کہہ سکتا ہے ؟ "
ماہن کی بیوی زور سے ہنسی ۔
رگی نے سنی اَن سنی کر کے کہا ۔
" مجھے میرا حصہ ملنا چاہیئے ۔ "
" لے بیس روپے تو بھی لے ۔ "

دمارو نے اپنی جیب سے بیس روپے دیتے ہوئے کہا ۔ وہ لاچی کے معاملے میں کسیطرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا ۔ رگی نے بیس روپے

اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے دمارو کی طرف شک کی نظروں سے دیکھا۔ بولا۔

" استنے روپے تو خانہ بدوشوں کی ملکہ کے پاس بھی نہ ہوں گے تمہیں کہاں سے ملے۔؟ "

" جعلی نہیں ہیں۔" دمارو نے جواب میں بڑی نخوت سے کہا۔ " جسے جی چاہے دکھا کے تسلی کر لے زیادہ پوچھنے کا تمہیں کوئی حق ہے؟ "

" نہیں سردار — "

رگی نے یکایک بڑی حلیمی سے کہا۔

" تو سودا پکّا۔؟ "

دمارو نے ایک بار پھر سب سے پوچھا

" پکّا — ! "

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد دونوں خانہ بدوش ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ دمارو نے مامن کی بیوی کا ہاتھ چوم کر کہا

" یاد ہے میں تجھ پر عاشق تھا لیکن تیرے باپ نے تجھے میرے ہاتھ نہیں بیچا رگی کو دے دیا۔ "

چند لمحوں کے توقف کے بعد دمارو نے مامن کی بیوی سے آہستہ سے پوچھا۔

"لاچی کہاں ہے ؟"

"خیمے میں سو رہی ہوگی ؟"

دمارو کیلئے اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ رسم ورواج کے مطابق اب اسے خیمے میں گھس کر لاچی کو اپنی باہوں میں اٹھا کر اپنے خیمے تک لے جانا تھا۔ اور لاچی کوئی نازک دُبلی پتلی راجکماری نہ تھی۔ اچھی خاصی مضبوط، ہٹی کٹی بھرے بدن کی لڑکی تھی اور وہ اب بڈھا ہوچکا تھا۔

"اُسے آواز دے کر جگادو یا اُسے جگا کر باہر لے آؤ۔ اور اُسے سب باتیں بتادو۔"

دمارو کمزور آواز میں بولا۔

رگی نے شریر لہجے میں کہا۔

"یہ غلط بات ہے رسم تو پوری کرنی ہوگی۔ خیمے کے اندر گھس کر لڑکی کو جگاؤ۔ وہ مزاحمت کرے تو اس کا مقابلہ کرو۔ اُسے اپنی باہوں میں اٹھا کر اپنے خیمے تک لے جاؤ گے تو لاچی تمہاری ہے ورنہ ـــــ"

لیکن ماہن نے رگی کی شرارت کو تاڑ لیا۔ ماہن کسیطرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ لاچی دھندہ تو کرتی نہیں تھی جتنا کماتی تھی سب اپنے آپ پر خرچ کرتی تھی۔ ایسی گھوڑی سے کیا فائدہ جو پیٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دے، لیکن گھاس کھاتی چلی جائے۔ ایسی خوبصورتی کو لے کر چاٹنا ہے کیا۔ اچھا ہوا اس نے لونڈیا کے ساڑھے تین سو وصول کر لئے ورنہ وہ تو پچاس میں بھی جاتی تو سودا بُرا نہ ہوتا۔ اس لئے ماہن نے دمارو کو تسلی دے کر کہا۔

"میں تمہارے ساتھ خیمے کے اندر چلتا ہوں ــــ دیکھتا ہوں کیسے وہ سور کی بچی ــــ"

ماہن اور دمارو دونوں ایک ساتھ مڑ کر خیمے کیطرف بڑھے اور دوسرے لمحے میں ایک ساتھ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

خیمے کی جھولتی ہوئی سرکی کو اوپر اٹھا کر لاچی باہر آ گئی تھی اس کے ہاتھ میں چاندی کی ہتھی والا خنجر تھا۔ اور اس کی گہری سبز آنکھیں سمندر کی طرح غضب آلود تھیں

" کس نے بیچا ہے مجھے ۔؟ " لاچی نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا کے پوچھا ۔

رگی، مامن ، دمارو تینوں چپ رہے ۔ رگی نے اپنے پاؤں اِدہر اُدہر کئے ، مامن نے اپنی نگاہیں پھیرلیں ۔ دمارو البتہ بالکل مبہوت ہوکر لاچی کیطرف دیکھتا رہا ۔ لیکن تینوں میں سے کوئی نہ بولا ۔

لاچی کی ماں بولی ۔

" عورت ، گھوڑی اور زمین ہمیشہ بکتی ہے ۔ تجھے سردار دمارو نے خرید لیا ہے ۔ "

" لاچی! میں نے تیرے لئے ساڑھے تین سو روپے دیتے ہیں ۔ " دمارو ایک قدم آگے بڑھا کر لاچی سے بولا ۔

" خبردار جو میری طرف آگے بڑھا ۔ "

" لاچی نے وہیں سے وہاں سے خنجر ہوا میں لہرایا ۔

دمارو پیچھے ہٹ گیا ۔

لاچی نے ماں سے کہا ۔

" ماں سردار کے پیسے کو لٹا دے ۔ "

ماں زور سے ہنسی ۔ اس کی طنز آمیز ہنسی کا خفتہ انگار تیر کیطرح لاچی کے سینے میں اُتر گیا ۔ لاچی دو قدم آگے بڑھ آئی ۔ پھر دو قدم اور بڑھی ۔ پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتے بڑھتے دمارو کے بالکل قریب چلی گئی ۔ خنجر اب تک اس کے ہاتھ میں تھا ۔ دمارو کے قریب جا کر خنجر کو بالکل اس کے چہرے کے سامنے کھڑا کر کے بولی ۔

" اگر ہمت ہے تو مجھے اُٹھا کر لے جاؤ ۔ میں خود نہیں جاؤنگی کیونکہ مجھے تیرا یہ لمبی ناک والا شتر مرغ کا سا چہرہ پسند نہیں ہے ۔ "

دمارو غصے میں پلٹا اور پلٹ کر بجلی کیطرح اس نے لاچی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا ۔ اور اُسے اپنے خیمے کیطرف لے چلا

لاچی اس کے بازوؤں میں تڑپی۔ اس کا خنجر ہوا میں لہرایا اور قریب تھا
کہ دمارو سردار کے سینے میں پیوست ہوجاتا لیکن دمارو نے اُسی
وقت اپنے دونوں بازو چھوڑ دیئے اور لاچی دھڑام سے زمین پر گر
گئی۔ اور خنجر بھی تک زمین میں گھس گیا۔ مامن نے بھاگ کر خنجر کو زمین سے
نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب لاچی خنجر لینے کیلئے بڑھی تو مامن نے
ایک زور کا ہاتھ دیا۔ جو لاچی کی گردن پر لگا۔ اور لاچی تیورا کر دمارو پر جا گری
جس نے اُسے پھر اپنے مضبوط بازوؤں میں باندھ لیا۔ لیکن لاچی داؤ لگا
کر ایک ناگنی کیطرح اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل بھاگی۔ دمارو
نے پھر اُسے پکڑ لیا اور دو گھونسے مار کر اُسے زمین پر گرا دیا۔ اور پھر غصے
میں اس کے بال پکڑ کر اُسے زمین پر گھسیٹنے لگا۔

لاچی نے اس کی کلائی پکڑ لی اور زور لگا کر اُسے اپنی
طرف کھینچا تو دمارو دُہرا ہو کر لاچی پر جا گرا۔ لاچی لچک کر، بل کھا کر الگ
ہو گئی اور جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ
کر بولی۔

"آؤ میرے سردار! مجھے اُٹھا کر لے جاؤ۔"

دمارو کی کہنی پر ضرب آ گئی تھی۔ اور اس کی سانس بھی پھول گئی
تھی لیکن وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ پھر آگے بڑھا۔ عجیب بات یہ ہوئی

کہ اب کے لاچی نے بالکل کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دمارو نے اُسے
ایک پھول کیطرح اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ اور اُسے اپنے خیمے کی
طرف لے چلا۔ ۱۳۹

ابھی دو چار قدم نہ گیا ہوگا کہ لاچی بغیر کسی مزاحمت کے اس
کے بازوؤں میں سے یوں نکل گئی جیسے پانی چھلنی سے بہہ جائے
اب لاچی پھر زمین پر گری اور بالکل بے بس نگاہوں سے دمارو کو دیکھ
رہی تھی۔ دمارو نے پھر ہمت کر کے اُسے اپنی بانہوں میں اُٹھالیا
اور اپنے خیمے کیطرف جانے لگا۔ اب کے وہ آدھا راستہ طے
کر گیا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد لاچی پھر لچک کر اس کے
بازوؤں میں سے پھسل گئی اور اپنے خیمے کو بھاگ گئی۔ دمارو اس
کے پیچھے دوڑا۔ خیمے کے قریب اس نے لاچی کو پھر جا پکڑا لیکن
لاچی نے جھک کر اس کی ٹانگوں میں گھس کر اُسے جو پٹخنی دی تو
دوسرے لمحے میں دمارو کا سر زمین پر تھا۔ اور ٹانگیں ہوا میں مُعلّق۔

دمارو کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور ایک پاگل ہانپتے ہوئے
بوزنے کیطرح چیختا چلاتا ہوا لاچی پر حملہ آور ہوا۔ اور لاچی نے پھر
اُسے پٹخنی دی۔ پھر پٹخنی دی۔ اب دمارو کا دم اکھڑ چکا تھا آخری
بار پٹخنی کھا کر اس سے زمین سے اُٹھا بھی نہ گیا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹا

لیٹا ہانپتا رہا۔ لاچی نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑ کے کھڑا کیا۔ اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اور بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر بولی۔

"میرے سردار! مجھے اپنے خیمے میں لے چلو۔"

دمارو نے اس کے زور سے لات مارنے کی کوشش کی۔ لیکن لات کھانے سے پہلے ہی لاچی وہیں زمین پر دوہری ہو گئی اور وہیں خاک میں لوٹتی، چکریاں لیتی دمارو سے اور دور چلی گئی اور دمارو اپنی ہی لات کے جھٹکے سے پھر زمین پر آ رہا۔ لاچی زور، زور سے ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اور اب تو سردار کی حالت دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ دمارو کو بہت غصہ آیا۔ وہ بولا

"مامن! تم لوگوں نے اِسے ساڑھے تین سو کے عوض میرے ہاتھ بیچا ہے یا تو لڑکی میرے حوالے کر دو یا میرا روپیہ مجھے واپس کر دو۔"

مامن بولا۔

"روپیہ نہیں مل سکتا۔"

مامن کی بیوی بولی۔

"لڑکی مل جائے گی ذرا صبر کرو۔"

لاچی بولی۔

"روپیہ مل جائیگا، میرا خیال چھوڑ دو۔"

دمارو کا بند بند دکھ رہا تھا۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال کی ایسی تیسی، میرا روپیہ واپس کر دو۔"

ماسن کی بیوی بولی۔

"روپیہ نہیں ملے گا۔"

"تو لڑکی دو۔"

"لڑکی بھی نہیں ملے گی۔" لاچی بولی۔

"تو روپیہ دو۔" دمارو بولا۔ "نہیں تو میں معاملہ پنچایت میں رکھونگا اور تمہیں برادری سے خارج کر دوں گا۔"

شہروں میں آج کل کسی کا برادری سے خارج ہونا کوئی ایسے قہر کی بات نہیں ہے لیکن کسی خانہ بدوش کیلئے اپنے قبیلے سے الگ ہونا قیامت سے کم نہیں۔ ماسن کانپ گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"روپیہ واپس کر دینا چاہیئے۔"

لاچی کی ماں بولی

" ہرگز نہیں۔ اس کُتیا کے لئے پھر ساڑھے تین سو کہاں سے ملے گا۔"

لاچی نے اپنی ماں کیطرف دیکھا اور بولی

" میں تیری بیٹی ہوں ماں۔ "

لاچی کی ماں بولی۔

" کچھ بھی ہو جائے روپیہ دمارو کو واپس نہیں ملے گا۔ ہم نے لڑکی بیچدی۔ شریفوں میں جب ایک بار سودا ہو جاتا ہے تو پھر واپس نہیں ہوتا۔ سودا سودا ہے۔ "

" ہاں یہ تو ٹھیک ہے سودا سودا ہے۔ " مامن بولا۔

" ہم نے لڑکی بیچ دی ہے۔ تم لاچی کو لے جاؤ۔ "

" مگر میں لاچی کو کیسے لے جاؤں ؟ "

دمارو ایک عجیب بے بسی کے عالم میں بولا

لاچی چیخ کر ہنس پڑی۔

ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ دمارو کی نقل کر کے بولی

" جیسے بھی ہو مجھے لے جاؤ۔ میرے مالک۔ "

" سؤر کی بچّی ! " دمارو غصے سے بولا۔

"سوّر کا بچہ ! " لاچی بہت پیار سے بولی

دمارو کچھ کہتا کہتا رک گیا۔ آخر وہ اپنے آپ پر جبر کر کے لاچی کے بالکل قریب چلا گیا۔ اور انتہائی سنجیدگی سے اس سے کہنے لگا۔

" میں تم پر اس کا فیصلہ چھوڑتا ہوں۔ تم فیصلہ کرو مجھے کیا ملنا چاہیئے لاچی یا ساڑھے تین سو روپے ؟ جو تم فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔"

لاچی کی گہری سبز ہنستی ہوئی آنکھیں ایک دم سنجیدہ سایوں میں کھو گئیں۔ اس نے اپنی ماں اور اپنے چچا کے حریص سخت گیر چہروں کیطرف دیکھا۔ پھر دمارو کے لٹکتے ہوئے چہرے کیطرف دیکھا اور اُسے دمارو پر رحم آگیا۔ بولی

" تجھے تیرا روپیہ واپس مل جائے گا۔"

" کب۔ ؟ "

" جب ہمارا قبیلہ بہار کا جشن منائے گا۔"

" مگر وہ تو تین مہینے کے بعد آئے گا۔ جب تک میں کیا کروں گا ؟ "

" میں تین مہینے کے اندر اندر تیرا روپیہ چکا دونگی۔"

" اگر تو نے نہیں چکایا تو ؟ "

" تو میں تیرے پاس آجاؤں گی۔ تیری لونڈی بن کر رہوں گی ۔

جو تو کہے گا وہی کرونگی ۔ "

دمارو نے لاچی کے خوبصورت چہرے کیطرف دیکھا اور اس کا دل خوشی سے لرزنے لگا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا

" خدا کرے تو کبھی روپیہ نہ چکا سکے ۔ "

اتنا کہہ کر دمارو تیزی سے پلٹا اور اپنے خیمے کیطرف چلا گیا ۔

٭ ٭ ٭

مامن اور اس کی بیوی خیمے کے باہر سوئے تھے ۔ لاچی خیمے میں سوئی تھی لیکن آج لاچی کو دیر تک نیند نہ آئی اور وہ دیر تک خیمے کی جالی ہٹا کر آسمان کو دیکھتی رہی اور دیر تک اس کا دل کسی دور افتادہ ستارے کیطرح لرزتا رہا ۔ میں کیا چاہتی ہوں ۔ اے پُراسرار آسمان ! کیوں میرا دل دوسری خانہ بدوش لڑکیوں کیطرح نہیں ہے ؟ کیوں میں دھندہ نہیں کر سکتی ، کما نہیں سکتی ، اپنا جسم نہیں بیچ سکتی ، میں تو ان سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت ہوں ۔ پھر یہ کیسا دل ہے میرا ؟ جو اپنے قبیلے ، اس کے رسم و رواج ، اس کی صدیوں پرانی ریت سے انکار کرتا ہے ؟ کیوں میں ایک خیمہ نہیں چاہتی ، ایک گھر چاہتی ہوں ۔ جب بس اڈے پر آ کر

رُکتی ہے۔ تو اس کے بلمبے ٹیڑھے میڑھے کیوٗ میں سینکڑوں ایسے آدمی کھڑے ہوتے ہیں، جو ہاتھوں میں سازو سامان سے بھرے ہوئے تھیلے لئے تھکے ہوئے قدموں سے گھر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ہی بس سے ایک ہی سڑک پر، اپنے ایک ہی گھر کو جاتے ہیں۔ اور ہم خانہ بدوش مختلف راستوں پر چل کر مختلف منزلوں سے گھومتے ہوئے کس گھر کو جاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے ؟'

اے چپ چاپ، ننگے تھکے، اونگھتے آسمان، کچھ تو بول، میرے دل میں ہلچل کیسی ہے ؟ کیوں میں چاہتی ہوں کہ بس کے اس لانبے اداس کیوٗ میں، کوئی اداس مرد میرے لئے بھی تھیلا لئے کھڑا ہو۔ اور ہر لحظہ مجھ تک پہنچنے کی تمنا کرتا ہو۔

وہ لوگ دیکھتے ہیں مجھے، کبھی کبھی کسی کی نگاہ جم جاتی ہے مجھ پر لیکن صرف وہ نظر، وہ اچٹتی پھسلتی ہوئی نظر میری ہوتی ہے۔ وہ مرد میرا نہیں ہوتا۔ میں چاہوں تو اپنے حسن کے زور سے اس کی زندگی کے چند لمحے، چند گھنٹے، چند دن، چند ماہ بھی چھین سکتی ہوں لیکن وہ مرد میرا نہ ہوگا۔

جس طرح وہ کیوٗ میں کھڑا ہے اور جس طرح وہ بس کا انتظار کر رہا ہے۔ اور جس طرح کی تصویر اس کی آنکھوں میں ہے اور جس طرح کا تصور اس کے دل میں ہے اور جس میٹھے اور مہربان انداز میں اس نے ڈھاک

کے پتوں میں اپنی بیوی کیلئے چمپا دنی کو چھپا رکھا ہے۔ وہ انداز میری روح کو کھائے جا رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس بس کے کیو میں کھڑے ہر مرد کا منہ نوچ لوں۔

ہائے اپنے پژمردہ تھکے ہوئے اداس اور جھنجلائے ہوئے چہروں کے باوجود یہ لوگ اندر سے کیسے خوش نظر آتے ہیں جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے، جیسے میلے کچیلے خیمے کے روزن میں سے بہار کی خوشبو آتی ہے۔ اسی طرح ان مردوں کے سانولے، میلے پسینے میں نہائے ہوئے چہروں کے اندر بار بار کیسی موم کی شمع سی روشن ہو جاتی ہے۔ کس کے تصور سے ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے کہ میں بھیک مانگتی مانگتی شرمندہ سی ہو جاتی ہوں اور میرے سینے میں ہوک اٹھتی ہے۔

کاش! میرے لئے بھی کوئی تھک جائے، چور ہو جائے اس قدر مجبور ہو جائے کہ اگر اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو تو چلتے چلتے کسی جھاڑی سے ایک پھول ہی توڑ کر میرے لئے لے آئے۔

ارے یہ کیسا دل ہے میرا۔ دوسری خانہ بدوش لڑکیوں سے کتنا الگ ہے جو اپنے قبیلے میں رہتی ہیں۔ خیمہ در خیمہ، شہر در شہر، اور گاؤں در گاؤں گھومتی ہیں۔ جن کا ایک زندگی کا خاوند ہوتا ہے اور ایک رات

یا ایک گھڑی کا خاوند بھی ہوتا ہے اور دونوں خاوندوں میں کوئی چپقلش نہیں ہوتی، بلکہ پہلا خاوند اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو سجا کر باہر بھیج دیتا ہے، جہاں وہ ایک رات یا ایک گھڑی گزار کر آتی ہے۔ اور اس طرح آتی ہے جیسے وہ اپنا جسم نہیں، ایک عینک، ایک چھلا بیچ کے آئی ہے اور آتے ہی اپنی ساری کمائی اپنے شوہر کے قدموں میں ڈال دیتی ہے اور اس کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔

میرا جسم، عینک یا چھلا کیوں نہیں ہے، کیوں مجھے وہ اپنی ہی روح کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے؟ جس کی بے حرمتی میں برداشت نہیں کر سکتی۔؟

اے ننگے، بھدے، غلیظ، کالے آسمان! تو نے مجھے کیوں ان خانہ بدوشوں میں پیدا کیا۔ پیدا کیا تھا تو روح بھی ایسی دیتا۔ جو ہر آن اور ہر لحظہ نت نئی جگہوں کا لالچ لے کے آتی۔ میں تو پیڑ کی طرح ایک جگہ گڑ جانا چاہتی ہوں، چاہتی ہوں ایک ہی جگہ میرا گھنا سایہ بڑھے، ایک ہی جگہ میرے پھولوں کی خوشبو پھیلے اور میرے پھلوں کا رس چھلکے۔ مجھے بہار بھی وہیں آئے۔ اور خزاں بھی وہیں اور اسی جگہ کی سردی گرمی کھا کر مجھے موت آئے۔ اور میں اس دھرتی میں سما جاؤں۔ لیکن یہ چلتے ہوئے خیمے، یہ بدلتے ہوئے مرد، یہ گزرتے ہوئے مناظر

جہنم جہنم !! "

اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی لاچی دھیرے دھیرے غم کے بارے سسکنے لگی. لاچی ایسی عجیب لڑکی تھی کہ جس ماحول میں رہتی تھی اس سے الگ سوچتی تھی. لاچی ایسی خوبصورت لڑکی تھی کہ اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو سیب کا پیڑ ہوتی.

ہمالیہ کی کنواری برف میں ڈھکی ہوئی چوٹی ہوتی. یا زیرِ آب سمندر کی ریت میں مستور کورل کا گلابی محل ہوتی. لیکن قدرت نے اُسے عورت بنایا تھا. اور ماحول اور اتفاق نے اُسے خانہ بدوش بنا دیا تھا. اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ کبھی انسان سے انصاف نہیں کرتیں. قدرت، ماحول، اتفاق، ان تینوں چیزوں کے زبردست ہاتھوں سے انصاف کو چھیننا پڑتا ہے.

لاچی کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے. اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اس نے ایک گہرے مصمم ارادے سے اپنے آپ سے کہا.

" میں چھین لوں گی، میں حاصل کر کے رہونگی. "

اس نے اُلٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور زمین پر لیٹ گئی.

یکایک خیمے کے پیچھے سے ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی خیمے
کے پردے پر مٹھی بھر بھر ریت پر گرا رہا ہو۔
لاچی اُٹھ بیٹھی
دیر تک اس آواز کو سنتی رہی
پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے آہ
بھری جیسے کسی نے آہستہ سے کہا ــــ" لاچی ــــ !"
لاچی یکایک خیمے کے پیچھے سے نکل کر باہر آگئی۔
باہر گل کھڑا تھا ــــ !

گل بلوچی کا لڑکا تھا اور بلوچی کو سب لوگ جانتے تھے کیونکہ بلوچی ریلوے ملازموں کو اور آس پاس کے رہنے والے سرکاری ملازموں کو روپیہ سود پر دیا کرتا تھا۔ گل بلوچی کا بیٹا تھا۔ مگر باپ اور بیٹے میں بہت فرق تھا۔

لاچی نے گل کو اکثر ریلوے اسٹیشن پر اور ریلوے کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ گل کا قد تو اپنے باپ کی طرح پورا، اونچا لانبا تھا۔ چھ فٹ کے قریب، لیکن گل اپنے باپ کیطرح چوڑا چکلا اور فربہ اندام نہ تھا، دبلا پتلا اور اکہرے جسم کا تھا۔ بلوچی کی بھنویں گھنی تھیں،

اور بڑے بڑے گل مچھے تھے لیکن گل کلین شیو تھا۔ بلوچی پرانے وضعدار لوگوں کیطرح کلاہ، لنگی اور شلوار قمیص پہنتا تھا۔ لیکن گل پینٹ۔ اور بش شرٹ پہنتا تھا۔ بلوچی کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوفناک تھیں اور جب وہ آنکھیں سرخ کرکے اپنے قرمنداروں کو ڈانٹتا۔

"تم سود کا روپیہ کیوں نہیں لاتے؟"

تو وہ لوگ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ گل کی آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں۔ لیکن ہر وقت جیسے سپنا دیکھتی رہتی تھیں اور بلوچی کہا کرتا تھا کہ یہ سب فرق اس لئے ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو الیف اے تک پڑھا دیا ہے۔ پڑھ لکھ کر بچے کی صحت غارت ہو جاتی ہے اور وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

لیکن گل اپنے باپ کا بہت کام کرتا تھا۔ اس کی میٹھی زبان اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر اکثر قرضدار باپ کی بجائے بیٹے سے ہی بزنس کرنا پسند کرتے تھے۔

بلوچی کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ روپے کی وصولی کو اکثر اپنے بیٹے ہی کو بھیجا کرتا تھا۔ لیکن وصولی کے سلسلے میں بیحد محتاط تھا۔ ایک ایک پائی کا حساب اپنے بیٹے سے لیا کرتا تھا۔ اور اگر بیٹا چار چھ روپے سود کے چھوڑ دیتا تھا تو اس سے گھنٹوں

جھگڑتا تھا، غُراتا تھا اور اگر بہت غصے میں ہوتا تھا تو گل کے ایک دو جبڑ بھی دیتا تھا اور گل ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح سب سہہ لیتا تھا.

اس وقت گل کو اپنے سامنے آدھی رات کے وقت دیکھ کر لاچی کو بہت حیرت ہوئی.

وہ بولی.

" تم بلوچی کے بیٹے ہو ؟ "

" ہاں ! میں گل ہوں. "

" کیا میرے باپ یا ماں کو تمہارا کوئی قرضہ دینا ہے ؟ "

" نہیں - "

" پھر کیوں آئے ہو ؟ "

گل چپ رہا.

" بولو ـــ "

لاچی ذرا تیزی سے بولی.

گل نے کہا

" مجھے تم سے کچھ کہنا ہے - "

" کہو - "

" یہاں نہیں - "

"تو پھر کہاں ؟"

گل نے گھوم کر جدھر اشارہ کیا۔ ادھر ریلوے کا ایک پرانا پل تھا۔ اسٹیشن یارڈ کے آوٹر سگنلوں کے قریب ایک زنگ آلود کہنہ پل جو اب استعمال نہ ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں جب یارڈ چھوٹا تھا اور اسٹیشن گمنام سا تھا۔

اس زمانے میں یہ پل استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اب، اب تو یارڈ اس پل کے دونوں طرف پھیل گیا تھا اور یہ پل جس کے نیچے سے اب یہ صرف دو ریلوے لائنیں گزرتی تھیں۔ یارڈ کی درجنوں پھیلی ہوئی چمکتی ہوئی فولادی لائنوں کے درمیان ایک بڈھے، ناکارہ پنشن خواہ ملازم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ عرصے سے ریلوے کے حکام نے اس پل کا جوڑ جوڑ الگ کر کے اسے یہاں سے ہٹا دینے کے احکام جاری کر رکھے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس پل کی ہستی کو بھول گئے ہیں۔ اسی لئے تو یہ پل ابھی وہیں کھڑا تھا۔ نہ جیتا تھا، نہ مرتا تھا۔ اس کی زنگ آلود بیچارگی پر کسی کو ترس نہ آتا تھا۔

گل نے کہا۔

"اس پل پر چلیں گے۔"

"اس پل پر کیوں ؟" لاجی نے کہا۔ "یہیں بتا دو نا۔"

"میرے ساتھ جانے سے ڈرتی ہو؟"

گل نے پوچھا۔

"ڈرتی تو میں اپنے باپ سے بھی نہیں، تم سے کیا ڈرونگی۔"

اتنا کہہ کر لاچی گل کے ساتھ ہولی، خیموں کے پیچھے ہوتے ہوئے وہ ریلوے کا فولادی جنگلہ اُولانگھ کر یارڈ کے اندر چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پرانے پل کی سیڑھیوں پر آپہنچے۔

"ذرا احتیاط سے!" گل نے لاچی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "بیچ بیچ سے سیڑھیاں غائب ہیں۔"

"اسی بہانے میرا بازو مت پکڑو۔" لاچی نے اپنا بازو گل سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "میری بھی آنکھیں ہیں۔ میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔ تم آگے آگے چلو۔ میں تمہارے پیچھے آتی ہوں۔"

گل نے فوراً لاچی کا بازو چھوڑ دیا۔ اور آگے آگے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں پل کے اوپر پہنچ گئے۔ یہاں سے اسٹیشن یارڈ، اس کی ہری اور لال بتیاں، دور تک چمکتی ہوئی فولادی لائنیں سرمئی دھاریوں کیطرح، ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی دور فضا میں گم ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اِدہر ریلوے اسٹیشن پر سناٹا تھا۔ اُدہر خانہ بدوشوں کے خیموں سے پرے گل مہر کے درختوں کی ننگی

سنسناتی ہوئی باہیں فضا میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ گویا مصروفِ دعا
گویا منتظرِ فصلِ بہاراں ۔

۵۵

گل نے کہا
" اِن ننگی شاخوں پر کب پھول کھلیں گے ۔ "
" اے بلوچی کے بیٹے ۔ ! " لاچی بڑی نخوت سے بولی ۔ تمھیں
مجھ سے کیا کام ؟ صاف صاف بولو ، پھولوں کا بھانسہ مجھے مت دو ۔
میں ہر روز ایسی باتیں سنتی ہوں تو میرے دل کا پھول ہے تو میرے
من کی رانی ہے ۔ تو میری دلنواز جانی ہے ۔ اور اگر میں یہ باتیں نہیں سنتی ہوں
تو میں مادر زاد حرامزادی کتیا ہوں ۔ رنڈی اور گشتی ہوں ، ایں ، کیا سمجھے ؟
مجھے تیرے باپ کا کوئی قرضہ نہیں دینا ہے ۔ "
گل پل کے پرلنے آہنی جنگلے پر جھک گیا ۔ آہستہ سے بولا ۔
" میں یہاں ہر روز آتا ہوں اسی وقت رات کے دو بجے ۔۔
جب یہاں کوئی نہیں ہوتا اور تیرے خیمے کو تکا کرتا ہوں ۔ "
لاچی مسکرا کے بولی ۔
" اب بات سمجھ میں آئی ۔ "
گل نے کہا ۔
" مجھے یہ پل بہت پسند ہے ۔ کیونکہ یہ پل کہیں جاتا نہیں ۔ "

لاچی نے پوچھا۔

"کہیں جاتا نہیں کا کیا مطلب ؟ کیا دوسرے پل کہیں جاتے ہیں۔ سبھی پل اپنی جگہ پر پڑے رہتے ہیں۔"

گل بولا۔

"ہاں ! لیکن دوسرے پلوں کے مسافر تو کہیں جاتے ہیں نا۔ دوسرے پل کسی کو کسی سے ملاتے ہیں لیکن یہ پل کسی کو کسی سے نہیں ملاتا۔ نہ کسی سڑک کو کسی سڑک سے، نہ کسی شہر کو کسی شہر سے، نہ کسی گھر کو کسی گھر سے، نہ کسی انسان کو کسی انسان سے !"

چھک چھک کرتی ہوئی مال گاڑی دیر سے آگے بڑھتی چلی آرہی تھی اب تو وہ اتنی قریب آگئی کہ اس کا سیاہ انجن مہیب اور بھیانک اور دیوزاد معلوم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے میں وہ مال گاڑی شور مچاتے ہوئے پل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ اور پرانا پل زور زور سے ہلنے لگا۔ اور اس کی ہر چول کھڑکھڑانے لگی۔ یکایک پل اتنے زور سے ہلا کہ لاچی ایک چیخ مار کر گل سے لپٹ گئی۔

چند لمحوں میں گاڑی گزر گئی۔

پل پھر ساکت ہوگیا۔ لاچی گل سے الگ ہوگئی لیکن گل کا ہاتھ بہت دھیرے دھیرے سرک کر لاچی کے ہاتھ سے الگ ہوا۔

گل نے مسکرا کے کہا .

" میرا اندازہ غلط نہیں نکلا . میرا خیال تھا تم عورت ہو . "

لاچی نے بڑی حقارت سے گل کیطرف دیکھا اور بولی .

" اب اس کے بعد تم یہ کہہ دو کہ میں خوبصورت ہوں ، بہت خوبصورت ہوں . تم مجھ پر مرتے ہو اور میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے تمہارے سوا . خدا کیلئے وہ سب باتیں فوراً کہہ ڈالو . جنہیں سنانے کیلئے تم مجھے اس پل پر لائے تھے . "

گل چپ رہا .

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے . لیکن ہمت کر کے وہ انہیں پی گیا . اس نے ایک آنسو بھی نیچے نہیں گرنے دیا . پھر وہ آہستہ سے بولا .

" میں تمہیں یہ پل دکھلانے لایا تھا . یہ پل جو کہیں جاتا نہیں . میری امیدوں کیطرح :

" پڑھے لکھے ہو نا ! اسی لئے بات کو گھما پھرا کے کہو گے لیکن مطلب وہی ہے . دوسروں کیطرح تم بھی میری عزت لینا چاہتے ہو . آخر کیوں نہ لو . میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں . "

گل نے دانتوں تلے اپنا نچلا ہونٹ رکھ لیا . لیکن کچھ

بولا نہیں۔ صرف اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولی

"چلو اب عشق ہو چکا۔ مجھے خیمے تک چھوڑ آؤ۔ ہاں مگر تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ عشق بازی کرنے کے مجھے کتنے پیسے دو گے؟"

گل تیزی سے گھوما۔

اس کا ہاتھ لاچی کو مارنے کیلئے اٹھ گیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور لاچی کی طرف پشت کر کے وہ تیزی سے پرانے پل کی سیڑھیاں اتر کے چلا گیا۔ وہ تیزی سے ریل کی پٹڑیاں پھلانگتا ہوا اپنے گھر کو جا رہا تھا۔

لاچی وہیں پل پر کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

اور دیر تک ہنستی رہی۔

جب وہ اس کی نظروں سے غائب ہو گیا تو وہ دھیرے دھیرے اس پل سے نیچے اُتری۔ اور اپنی کمر کو رقص کے انداز میں جھلاتی ہوئی اپنے خیمے کو چلی گئی۔

دوسرے دن لاچی نے روشی سے مشورہ کیا۔ بڑ روشی کی

عمر بیس سال سے اوپر ہو گی. اس کا حسن بجھتا جا رہا تھا. جسے وہ سرخی غازے سے ہر روز جلا دیتی تھی ۔ روشی خانہ بدوش لڑکیوں میں سے سب سے چنٹ اور خرانٹ اور تجربہ کار عورت تھی. اس کے گاہک سب سے زیادہ امیر ہوتے تھے اور اس کے کپڑے بھی سب سے زیادہ قیمتی ہوتے تھے. اور اس کا شوہر جمعرا دن رات شراب پیتا تھا اور روشی کی آمدنی کا بیشتر حصہ شراب اور جوئے میں صرف کرتا تھا. اور روشی کو مہینے میں دو چار بار پیٹ دیا کرتا تھا. روشی انتہائی سعادتمندی سے یہ مار کھا لیا کرتی تھی کیونکہ اس کا اعتقاد تھا کہ اس دنیا میں ہر شوہر کو اپنی بیوی کو پیٹنے کا حق حاصل ہے. مار کھا کھا کر وہ اس پٹائی کو بھی پسند کرنے لگی تھی ۔ بلکہ جب زیادہ دن ہو جاتے تو روشی کی کھال خود اس پٹائی کیلئے تلملانے لگتی تھی ۔

اس کے سارے جسم میں خارش سی ہونے لگتی تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے شوہر سے اُلجھ پڑتی اور پھر پٹ کر اپنے خاوند کے پاؤں دبانے لگتی. اُسے اپنے خاوند سے بہت محبت تھی ۔ محبت تو اسے اپنے گاہکوں سے بھی ہو جاتی تھی ۔ لیکن وہ تو بس گھڑی دو گھڑی کی محبت ہوتی تھی لیکن خاوند تو خاوند ہے اور گاہک تو صرف گاہک ہیں ۔ دوکان سے سودا تو ہر کوئی خریدتا ہے لیکن دوکان کا مالک تو صرف ایک ہی ہوتا ہے نا ۔

روشنی بہت سمجھدار عورت تھی۔ وہ زندگی سے بڑی خوبصورتی سے مفاہمت کرنا جانتی تھی۔ دراصل یہ دنیا ایسی ہی سمجھدار عورتوں اور مردوں پر قائم ہے۔ ورنہ کب کی ختم ہوگئی ہوتی۔ اسی لئے روشی سے لاچی نے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔

روشنی نے بات سن کے کہا۔

" ساڑھے تین سو روپے، ساڑھے تین سو روپے کیا چیز ہیں تیرے لئے تو ہاں کر، میں ابھی تجھے ساڑھے تین سو کا گاہک دلائے دیتی ہوں ۔"

" لیکن مجھے گاہک نہیں چاہیئے۔"

" تو گاہک کے بغیر ساڑھے تین سو کہاں سے ملیں گے ؟" روشنی حیرت سے بولی۔ " تو روپیہ بھی چاہتی ہے اور دھندہ بھی نہیں کریگی ایسا کیسے چلے گا۔"

" اگر ایسا نہیں چلے گا تو پھر مجھے بھی کچھ نہیں چاہیئے۔"

لاچی ایک دم خفا ہو کے روشی کے پاس سے پلٹ آئی۔ اور روشنی دیر تک لاچی کو جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ سوچتی رہی۔ پھر وہ اپنے دل ہی دل میں ہنسی۔ کیسی پگلی لڑکی ہے اسے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ اس کے بعد وہ اپنی عینکوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

ایک بابو اس کے سر پر آکر کھڑا ہو گیا۔
روشنی نے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور مسکرا دی۔
" بابو عینک چاہیئے ؟ "
بابو بولا۔ " عینک تو میری آنکھوں پر موجود ہے۔ "
" پھر کیا چاہیئے ؟ چھلا، انگوٹھی، منکے، نگینے جو لینا ہو لے لو۔ "
روشنی ہنس کر بولی۔
" مجھے ایک موتی چاہیئے۔ "
بابو نے آنکھ مار کر اس سے کہا۔

روشنی سے ہٹ کر لاچی مادھو کی دکان پر آئی اور سیبوں
کی ٹوکری سے ایک سیب اٹھا کر کھانے لگی۔ مادھو ذرا سا مسکرا
دیا۔ کیونکہ اس کی دکان پر اس وقت تین گاہک کھڑے تھے اور
وہ سودا بیچ رہا تھا۔ جب گاہک چلے گئے۔ تو لاچی نے تین چوتھائی
سیب کھا لیا تھا۔ مادھو نے ٹوکری سے ایک اور سیب اُٹھایا
اور لاچی کو پیش کیا۔

لاچی نے پہلا سیب نالی میں پھینک دیا اور مادھو کا پیش
کیا ہوا سیب کھانے لگی۔ سیب کھاتے کھاتے بولی۔

" مادھو! تم مجھے بہت چاہتے ہو ؟ "

مادھو جواب میں کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ پھر اس نے شرم سے منہ پھیر لیا۔

لاچی کو مادھو کی یہ ادا بہت پسند آئی۔

وہ بولی

" بتاؤ مادھو، تم مجھے کتنا پسند کرتے ہو ؟ "

مادھو شرماتے ہوئے بولا۔

" اپنی روجی سے جیادہ، اپنی دکان سے جیادہ، اپنے رزق سے بھی جیادہ — ! "

" جو میں کہوں گی اُسے پورا کرو گے ؟ " لاچی بولی۔

مادھو کے دل میں جانے کہاں سے دلیری آگئی۔ ایک دم بول اُٹھا۔

" تم چاہو تو میں دکان چھوڑ دوں، یہ سارے پھل نالی میں پھینک دوں۔ تم چاہو تو میں گاڑی کے آگے لیٹ جاؤں۔ تم چاہو تو ...... "

" بس بس۔ " لاچی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا

" میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم میرے لئے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے کا بندوبست کردو۔ "

" ساڑھے تین سو ! ؟ " مادھو ایک دم بجھ سا گیا۔ " ساڑھے تین سو کہاں سے لاؤں گا۔ میری تو ساری پونجی یہ پھل ہیں۔ ساٹھ ستّر کے یہ پھل ہوں گے۔ پچاس ساٹھ کے میرے گھر میں ہونگے۔ "

" میں نہیں جانتی کہ تم کہاں سے لاؤ گے مگر تم میرے لئے لاؤ گے، نہیں تو میں زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گی۔ "

لاچی ایک ادا سے خفا ہو کے بولی۔

" نہیں، نہیں۔ " مادھو گھگھیا کے بولا۔ " لاچی اتنی خفا نہ ہو دیکھ میری طرف دیکھ لے۔ بس ایک نظر سے دیکھ لے۔ "

" اچھّا دیکھتی ہوں ! "

لاچی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چمکائیں اور مادھو کے دل میں جیسے بجلی کوند گئی۔ ایک لمحے کیلئے وہ جیسے سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔ آہستہ سے بولا۔

" دیکھ تو آج شام کو آنا۔ میں کہیں سے بندوبست کرتا ہوں۔ "

" اچھّا۔ ! " کہہ کر لاچی مادھو کی دکان سے چلی گئی۔ اس کے سر سے بوجھ اُتر گیا تھا۔

اس دن اس نے یارڈ سے سرکاری کوئلہ پھر چرایا اور اُسے حلوائی کے ہاں بیچ کر ڈیڑھ روپیہ وصول کر لیا۔ اس ڈیڑھ روپے

کو حاصل کرنے کیلئے اُسے یارڈ کے تین چکر لگانے پڑے۔ اس کے بعد اس نے ریلوے کوارٹروں کے کئی چکر لگا ڈالے۔ آخر وہ علی بھائی ٹکٹ چیکر کے پچھواڑے سے ایک پلا ہوا مرغ چرانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس مرغ کے اُسے ساڑھے تین روپے ضرور مل جائیں گے۔ مگر قصائی نہ مانا۔

"یہ حرام کا مال ہے۔"

"مگر پلا ہوا ہے میں اس کے ساڑھے تین لوں گی۔"

"میں ڈیڑھ سے زیادہ نہ دوں گا۔"

"ڈیڑھ دے کر تم اسے پانچ میں بیچو گے۔ کچھ تو شرم کرو۔ میں ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں۔"

"میں ایک غریب قصائی ہوں۔"

"مجھے ساڑھے تین سو کا قرضہ چکانا ہے۔"

"میرے پانچ بچے ہیں، تین بیویاں ہیں۔"

"چوتھی کی فکر کب کرو گے؟"

لاچی نے مذاق کیا۔

"جب تم ہاں کر دو گی۔"

لاچی ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔

"اچھا چلو تین روپے دیدو۔"

"پونے دو۔"

"اچھا ڈھائی دے دو۔"

"دو لینے ہیں تو لے جاؤ۔ ورنہ ان سے بھی جاؤ گی۔ اُدھر دیکھو۔"
سامنے سے پولیس کا سنتری چلا آ رہا تھا۔ لاچی ڈر گئی۔ اس نے جلدی سے مرغ قصائی کے حوالے کر دیا۔ اور اس سے دو روپے لے کے چلتی بنی۔ اب تک اس کی جیب میں ساڑھے تین روپے آ چکے تھے مگر اس طرح سے کیا ہوگا۔ لاچی چند لمحوں کیلئے فکر میں ڈوب گئی۔ پھر اس کے دل میں وعدے کا خیال آیا اور اس کی بشاشت لوٹ آئی۔ اور وہ قصائی کے ہاں سے لوٹ کے سارا بازار گزر کے واپس بس کے اڈے پر آ گئی۔ بھیک مانگنے کیلئے بس کے اڈے پر صرف دو مچھلی بیچنے والیاں کھڑی تھیں۔ مارکیٹ میں مچھلیاں بیچ کے آئی تھیں۔ اور اب خالی ٹوکریاں لئے ہنس ہنس کے ایک دوسرے سے بات کر رہی تھیں۔ جب لاچی نے دستِ سوال آگے بڑھایا تو ان میں سے ایک جھڑک کر بولی۔

"شرم نہیں آتی مسٹنڈی! جوان جہاں لوٹھا سی ہو کر بھیک مانگتی ہے جا کوئی گھر کر لے۔"

" تیرے گھر چلی جاؤں ؟ "

لاچی نے چمک کر جواب دیا۔

مچھلی والی اسے مارنے کیلئے دوڑی۔ لاچی ہنستے ہوئے بھاگ گئی۔

۔۱۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں مچھلی والیاں ایک بس میں سوار ہو کر چلی گئیں اور اڈہ پھر خالی ہوگیا۔ لاچی پھر اڈے پر واپس آگئی۔ اب کے دھنیا بھکارن بوڑھی اور اندھی اڈے پر کھڑی خالی اڈے سے بھیک مانگ رہی تھی۔

لاچی نے اُسے سمجھایا۔

" اڈہ خالی ہے تُو کس سے بھیک مانگتی ہے ؟ "

" تم کون ہو ؟ "

دھنیا بھکارن اپنی کڑوی کراری آواز میں بولی۔

" میں بھی تیری طرح ایک بھیک مانگنے والی ہوں۔ " لاچی یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔

" جوان ہنسی ہے تیری ! " دھنیا غصے سے بولی۔ " لعنت ہو تجھ پر، کیوں مجھ غریب بھکارن کی روزی تباہ کر رہی ہے۔ "

" میں کیا کہہ رہی ہوں تجھے ؟ " لاچی حیرت سے بولی۔

دیتر ے ہوتے ہوئے مجھے کون بھیک دے گا۔ ؟ " دھنیا بہت افسردگی سے بولی۔ " کیسا زمانہ آیا ہے لوگ بھیک دیتے ہیں تو اچھی صورت دیکھ کر، غریب اندھی بڈھی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ "

یہ بالکل سچ تھا۔ لگلے تین چار گھنٹوں میں لاچی نے بھیک مانگ مانگ کر ڈھائی روپے کمائے۔ لیکن اندھی بڈھی دھنیا کے پاس مشکل سے دس پیسے جمع ہوئے ہوں گے۔ وہ ابھی اسے صرف عورتوں نے رحم کھاکے دیئے تھے۔ لاچی غور سے دیکھتی رہی۔ کسی جوان مرد نے اسے ایک پیسہ نہیں دیا۔ سب لاچی کو گھورتے تھے۔ لاچی کے دل میں ایک عجیب سی مسرت کی لہر آئی۔ وہ پلیٹ کے سامنے پانوالے کی دکان پر چلی گئی۔ اور اس سے دو پیسے کا پان کھا کے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں پان کی دوکان پر بھیڑ لگ گئی۔

" دو پیسے کا گھوڑا مارکہ بیڑی دینا۔ "

" ایک آنے کی سلطان صاحب بیڑی ! "

" کونڈر کا آدھا پکیٹ۔ "

" وہی سادہ۔ "

" کالا کانڈی لونگ سپاری۔ "

لاچی نے اپنے گھاگرے کے نیفے سے دو پیسے نکال

کے پان والے کو دینے چاہئیے۔

پان والے نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ بولا

" جانی! بس تو ادھر میری دکان پہ آکے کبھی کبھار دو منٹ کیلئے کھڑی ہو جایا کر۔ اپنے تو پان کے پیسے یوں ہی وصول ہو جاتے ہیں۔"

" ہشت سور کی اولاد۔ "

لاچی نے پان والے کو گالی دی۔ پھر اس نے زور سے پان کی پیک نالی میں گرادی۔ اور اپنا نیلی چھینٹ کا گھیرے دار گھاگرا اچھالتی ہوئی مادھو کی دکان پر چلی گئی۔ کیونکہ اب شام ہو چلی تھی۔

جب لاچی دکان پہ پہنچی تو مادھو اپنی دکان بند کر رہا تھا۔ وہ قریب کھڑی کھڑی اُسے دکان بند کرتے دیکھتی رہی۔ مادھو تو اتنی جلدی کبھی دکان بند نہ کرتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے، پولیس کی رونڈ آنے سے پہلے کہیں دکان بند کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ آج اُسے کیا ہو گیا؟ یکایک لاچی کے دل میں خیال آیا' یہ کم بخت میرے آنے سے پہلے ہی دکان بند کر کے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اچھا ہوا میں نے اسے بھاگنے سے پہلے پکڑ لیا۔

لاچی وہیں مادھو کے پیچھے کھڑی رہی۔

چپ چاپ۔

جب مادھو دکان بند کر کے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالتے ہوئے پلٹا تو اس نے لاچی کو اپنے پیچھے کھڑی پایا۔ وہ ایک دم چونک گیا کچھ جھینپ گیا۔

لاچی بولی۔

"کیوں بھاگ رہے تھے مادھو ؟"

"نہیں !" مادھو انکار کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو دکان بند کر رہا تھا۔ اور دکان بند کر کے تیری راہ دیکھتا۔"

"پیسے لائے ؟"

"شش ! آہستہ بول۔" مادھو نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی سن لے گا۔"

"سن لے گا تو کیا کرے گا ؟" لاچی پھر بے خوفی سے بولی۔

"تو نہیں سمجھتی، اِدھر آ ٹیکسی میں بیٹھ ! تجھے بتاتا ہوں۔"

لاچی نے مڑ کے دیکھا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ لاچی مادھو کیساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور ٹیکسی گھما کر اسٹیشن کے اڈے سے باہر لے گیا باہر سڑک پر جا کر ٹیکسی ایک طرف کر کے روک دی گئی۔ یہاں پر درخت کا

گھنا سایہ تھا۔ اور ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ تھا۔ یہاں ٹیکسی رکوا کے مادھو نے اپنی جیب سے نوٹ نکالے اور انھیں لاچی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"بڑی مشکل سے سو روپیہ ہوا ہے گن لے۔"

دس کے، پانچ کے، دو کے، ایک کے نوٹ تھے میلے اور مڑے ہوئے پسینے اور بدبو کے مارے ہوئے، کچھ نقدی تھی۔ اٹھنیاں چونیاں، دونیاں، اکنیاں، مگر لاچی نے انھیں گن کے کہا۔

"یہ تو صرف ایک سو ہیں۔" ۱/۔

"یہی میری ساری پونجی ہے اسے رکھ لے۔"

لاچی نے روپے رکھ لئے۔

مادھو کے سبزی مائل چکنے ہونٹوں پر رال کا لعاب چمکنے لگا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں لاچی کے ہاتھ کو چھونے لگیں۔ اور مادھو آہستہ سے کہنے لگا۔ "اب کہیں چلیں گے؟"

"کہاں چلیں گے؟"

لاچی نے پوچھا

"کہیں بھی سیر کیلئے چلیں گے۔" مادھو کانپتی آواز میں بولا اور اس کی ترستی ہوئی انگلیاں لاچی کے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ کہنے لگیں

یکایک لاچی کے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بچھو یا گندی نالی کا کوئی لجلجا، پلپلا سا کیڑا، اس کے جسم پر رینگ رہا ہو۔ اس نے سو روپے کے نوٹ زور سے مادھو کے منہ پر مارے اور جلدی سے ٹیکسی کا پٹ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں کی گہری سبز جھیلوں میں غصے کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"کمینے کُتّے!" لاچی نے ایک پتھر اٹھایا۔

ڈرائیور نے جلدی سے ٹیکسی سٹارٹ کر دی اور مادھو کو لیکر بھاگ گیا۔ پتھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، ٹیکسی کے مڈگارڈ کو چھوتے ہوئے گزر گئے۔ شکر ہے ٹیکسی کا کوئی شیشہ نہیں ٹوٹا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے شکر ادا کیا۔ ورنہ لاچی کے غصے سے خدا بچائے غصے میں یوں بھی نشانہ چوک جاتا ہے۔"

لاچی نے چوتھا پتھر اٹھا لیا تھا۔ مگر ٹیکسی غائب ہو چکی تھی اور پتھر اس کے ہاتھ میں تھا۔ لاچی نے ایک لمحے کیلئے پتھر کیطرف دیکھا۔ پھر خالی سڑک کو دیکھا۔ پھر اس نے زور سے پتھر سڑک پر پھینک دیا۔ اور بے بس ہو کر رونے لگی۔ اُسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیا سمجھی تھی مادھو کو اور مادھو کیا نکلا۔

پبلک ٹیلی فون کے قریب رک کر اس کے دل میں ایک

لمحے کیلئے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ بوتھ کے اندر جا کر خدا کو ٹیلی فون کرے اور اس سے ساڑھے تین سو روپے مانگ لے۔ کیا خدا تک یہ ٹیلی فون نہیں پہنچتا؟ کیوں نہیں پہنچتا۔ آخر کیوں خدا اُسے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے نہیں دیتا؟ کوئی اتنی بڑی رقم تو ہے نہیں۔ آخر کیوں اس دنیا میں کوئی ایک لڑکی کی عزت لئے بغیر اُسے ساڑھے تین سو روپے دینے کیلئے تیار نہیں ہے؟

"ڈارلنگ! یہاں کسے ٹیلی فون کرنے کیلئے رُکی ہو؟ آؤ، میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

لاچی نے پلٹ کے دیکھا۔ خوبصورت آسمانی رنگ کی پلائی متھ میں ایک نوجوان گاڑی چلاتا ہوا اس کیطرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

لاچی نے ایک پتھر اُٹھایا۔

کار پٹرول کا غبار چھوڑتے ہوئے زُوم سے بھاگ گئی۔

شام کو جب لاچی ٹیلے سے گھوم کے اپنے خیمے کو جانے لگی تو اس کے باپ نے روز کی طرح دستِ سوال دراز کیا۔ لاچی نے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور پلٹ کے چلنے لگی۔ رگی نے آگے بڑھ کے اس کا راستہ روک لیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"کہاں جاتی ہے میرے پیسے دیتی جا۔"

لاچی نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا ہاتھ رگی سے چھڑا لیا اور الٹے ہاتھ سے ایسے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا کہ ہونٹوں سے خون نکل آیا۔ رگی حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔ آہستہ سے اس

نے اپنے ہونٹوں سے لہو صاف کیا۔ اور پھر اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھنے لگا۔ جہاں تر و تازہ اور سرخ لہو کی ایک چمکتی ہوئی لکیر ہتھیلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنچی ہوئی تھی۔

لاچی بولی۔ "اگر تم میرے باپ ہو تو آئندہ جب تک میں دمارد کا روپیہ نہ چکادوں کبھی مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ طلب کرنا۔"

رگی نے غور سے اپنے خون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ساڑھے تین سو روپے تم اکیلی کیسے چکاؤ گی ؟"

"تم دیکھتے جاؤ ـــ"

لاچی ایک فیصلہ کن انداز میں بولی۔

رگی نے بہت افسردگی سے کہا۔

"تمہارا جسم عورت کا ہے دل مرد کا ہے، بس یہی سوچ کر افسوس ہوتا ہے۔"

"کیوں ؟" لاچی نے رک کر پوچھا۔

رگی بولا۔

" زندگی مختصر ہے، جوانی اُس سے بھی مختصر، حسن اس سے بھی مختصر ہے۔ اس لئے میرا باپ کہتا تھا، گاؤ بجاؤ، دف بجاؤ جہاں تک ہو سکے کام نہ کرو اور ہمیشہ چلتے چلو۔ کسی ایک جگہ بیٹھ

جاتا جیسے آدمی شاخ میں لگے ہوئے پتے کی طرح ایک روز سڑ کر گر جاتا ہے"

اس نے لہو کو اپنی میلی آستین سے پونچھ دیا۔

لاچی نے کہا۔

"مجھے خیمہ نہیں چاہیئے، مجھے ایک گھر چاہیئے۔"

ایک آہ کیساتھ، ایک عجیب بیقراری کیساتھ، انتہائی سنجیدگی کیساتھ، اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلے، وہ اپنے احساس کی شدّت سے خود ہی گھبرا گئی۔ اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔

رگی اُسے دیکھتا رہ گیا۔

دمارو اپنے خیمے کے باہر چٹائی بچھائے پی رہا تھا۔ رومشی اور جاماں اس کی بغل میں تھیں۔ لاچی نے جاتے ہی چھ روپے نکال کے اس کی ہتھیلی پر رکھے۔ دمارو روپوں کو لے کر ہنسنے لگا۔

"اس طرح کتنی مدت میں قرضہ چکاؤ گی۔"

"اسی مدت میں چکا دُونگی جس کا وعدہ کیا ہے۔ تم فکر کیوں

کرتے ہو؟"

"تمہارے پھول ایسے جسم کی مجھے فکر نہ ہوگی تو اور کسے ہوگی؟"

دمارو ہنسا۔ اس کے ساتھ لڑکیاں بھی ہنسیں۔ لاچی چپ رہی

دمارو نے درختوں کی قطار کو غور سے دیکھا۔ ان کی ننگی شاخوں کو گھورا۔ پھر نگاہیں ہٹا کر بولا۔

"درخت بھی انتظار کرتے ہیں۔ وہ بھی میرے دل کی طرح انتظار کرتے ہیں۔"

"بہار ابھی بہت دور ہے۔"

لاچی اطمینان سے اپنی انگلیاں نچاتے ہوئے بولی۔ اور لچک کر وہاں سے چل دی اور دمارو اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ لاچی کی مستانہ خرامی دیکھ کے جاماں اور روشی کے دل میں رشک و حسد کا شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ جاماں نے دانت پیس کر کہا۔

"مالزادی بڑی پارسا بنتی ہے۔"

دمارو نے دھیرے دھیرے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"اِک ذرا ٹھہر جاؤ۔ تم دیکھتی جاؤ کیا ہوتا ہے۔"

آج لاچی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ خیمے کی دیواریں قیدخانے

کی دیواروں کیطرح چاروں طرف سے اس کے قریب سرکتی ہوئی، اس کا گلا گھونٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ دور گھڑیال نے بارہ بجائے، ایک بجا یا دو بجائے لیکن آنکھوں میں نیند پھر بھی نہ آئی۔ تولاچی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور خیمے کے پیچھے سے باہر نکل گئی۔

باہر جا کے اس نے آنکھیں ملیں، ایک لمبی سانس لی۔ یکایک اس کی نگاہ دُور، سامنے کے پرانے پل پر پڑی۔ جس کی پشت پر آؤٹر سگنل کی ہری اور لال بتیاں روشن تھیں۔ پل کے اوپر ایک سایہ کھڑا تھا اور اتنا ساکت و جامد، جیسے وہ خود بھی پل پر ایستادہ ایک سگنل ہو۔

گل

لاچی کے سارے جسم میں بے اختیار ایک انگڑائی آئی اور وہ سر سے پاؤں تک نشے میں جھوم گئی۔ ایک عجیب فتحمندی اور غرور کے احساس سے اس کا رُواں رُواں سرشار ہو گیا۔ پہلے اس کے جی میں آیا کہ وہ واپس خیمے میں چلی جائے۔ لیکن اس کے قدم پلٹ نہ سکے اور وہیں کھڑی رہ کر اس سائے کو دیکھنے لگی۔ جو اب تک جامد و ساکت اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ پھر وہ یکایک تیز تیز قدموں سے لائنیں پھلانگتی ہوئی پرانے پل کیطرف چلی گئی۔

"میرا خیال تھا تم ضرور آؤ گی! "

گل نے آہستہ سے اس وقت کہا، جب لاچی اس کے قریب آ کر پل پر جھک گئی۔ بالکل اسیطرح جس طرح وہ جھک گیا تھا۔

"ہونہہ!"

لاچی نے بڑی نخوت سے کہا۔ "میں تو محض اس لئے چلی آئی کہ خیمے میں بڑی گرمی تھی۔"

گل چپ ہو گیا۔

دونوں بہت دیر تک چپ رہے۔

یارڈ بالکل خاموش تھا۔ دور کہیں کسی جانیوالی گاڑی کی چھک چھک سنائی دے رہی تھی اور آہستہ آہستہ فضا میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

"سنا ہے تمہیں ساڑھے تین سو روپے چاہئیں۔"

"کچھ کم ساڑھے تین سو!"

گل بہت دیر تک چپ رہا۔

"میں تمہیں کل نہیں تو پرسوں کہیں سے لا دونگا۔"

"کہاں سے لاؤ گے؟"

"میرا باپ سود پر پیسہ دیتا ہے نا، اس سے مانگ لوں گا۔"

"کیا کہو گے؟"

"جھوٹ تو نہیں بولوں گا۔ سچ سچ کہہ دوں گا!"

"پیسے لادو گے ؟"

"کل نہیں تو پرسوں ۔"

"پرسوں کہاں پر ملو گے ؟"

"اِسی پل پر ۔"

"کس وقت ؟"

"اسی وقت !"

"اور اپنی ٹیکسی کہاں کھڑی کرو گے ؟"

گل حیرت سے اس کیطرف دیکھنے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی ۔

"کون سی ٹیکسی ؟"

اس نے بہت حیرت سے پوچھا۔

"وہی ٹیکسی جس میں تم روپیہ ادا کر کے مجھے کہیں لے جاؤ گے ؟"

گل کی سمجھ میں اب بات آگئی اس کا سر جھک گیا اور اس کے منہ سے ایک آہ نکلی ۔

لاچی نے بہت تلخی سے کہا ۔

"میرے سامنے یہ آہ نہ بھرو ۔ میں جب سے جوان ہوئی ہوں دن بھر یہی آہیں سنتی ہوں ۔ بس اڈے پر، اسٹیشن کے یارڈ میں، قصائیوں

کی دکانوں پر، گلی میں، بازار میں، جدھر سے گزرتی ہوں بالکل اسی طرح آہیں سنتی ہوں، کیا تم نے اس کتے کو دیکھا ہے جو مڈی دیکھتے ہی زبان باہر نکالنے لگتا ہے۔"

"سبھی مرد ایک سے نہیں ہوتے!"

"سبھی کتے ایک سے ہوتے ہیں!"

گل نے لاچی کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ وہ لاچی کے بازو کو اپنی انگلیوں میں زور سے مسلتے ہوئے بولا

"خدا کی قسم بہت خبیث عورت ہو، خبیث اور جاہل، مجھے تم سے نفرت ہے! نفرت ہے!! نفرت ہے!!!"

"پھر اس پل پر کیوں آئے ہو؟"

لاچی نے یکایک بہت نرم اور کمزور آواز میں کہا۔

گل نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے فوراً اپنا ہاتھ لاچی کے بازو سے ہٹا لیا۔

لاچی نے اپنے بازو کو دیکھ کے گل سے کہا۔

"دیکھتے نہیں ہو۔ تم نے اپنے ناخن اس میں گڑو دیئے ہیں جنگلی؟"

واقعی لاچی کے سنہری صندلی بازوؤں پر ناخنوں کے گڑ جانے سے سرخ سرخ نشان پڑ گئے تھے۔ اور ان میں سے خون جھلک رہا تھا

اس خون کو دیکھ کر گل بیتاب ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں اس طرح لے کہ لاچی کی سانس رُک جائے۔ مگر وہ لاچی کی طرف بڑھتا بڑھتا رک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو پکڑ لیا اور انھیں زور زور سے جھٹکے دیئے۔ پھر پلٹ کر گل کی طرح لاچی سے کچھ کہے بغیر پل کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

لاچی ہنسی۔

پہلے آہستہ سے ہنسی، پھر زور زور سے ہنسی، پھر بالکل ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بھاگتے بھاگتے گل کو ایسا محسوس ہوا جیسے لاچی اپنے جسم اور روح کی حقارت آمیز ہنسی سے اس پر وار کر رہی ہو۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ریل کی پٹڑیاں پھلانگتا ہوا یارڈ کے دوسری جانب گم ہو گیا۔

جہاں ایک مال گاڑی کتنے دنوں سے کھڑی گھاس کے گٹھے لادے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ یکایک لاچی ہنستے ہنستے چپ ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنا وہ بازو اوپر اٹھایا جس پر گل کے ناخنوں کے سرخ سرخ نشان تھے۔ یہ ہلال کے نشان! جن میں کسی کی اُمیدوں کا خون تھا۔ لاچی کو یکایک بہت پسند آ گئے۔ اس نے جھک کر ان نشانوں کو اپنے ہونٹوں سے چوم لیا اور بولی۔

"میرے زخم! میرے پیارے زخم!! میرے ننھے منّے نازک

ناتواں سے زخستم !!! "

اس کے بعد وہ اپنے خیمے میں جا کے بہت اطمینان سے سو گئی۔ بیخوف وخطر، ایسی گہری نیند میں مستغرق سوئی کہ جب صبح اٹھی تو دھوپ خیمے کے اندر آچکی تھی اور چچا ماحن چٹائیاں بن رہا تھا اور اس کی ماں خیمے کے باہر روٹی پکانے میں مصروف تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

دوسرے دن لاچی نے رات کے دو بجے تک گل کا انتظار کیا۔ لیکن اُسے پل پر کسی کا سایہ نظر نہ آیا۔ تیسرے دن اس نے پھر انتظار کیا لیکن گل پھر کہیں اُسے دکھائی نہ دیا۔ تین چار دن اور انتظار کرنے کے بعد لاچی نے بھی اس واقعے کو اپنے دل سے بھلا دیا۔ اس کے زخم اب بھر گئے تھے اور ان پر بھورے بھورے کھرنڈ آ گئے تھے۔ لاچی نے اپنے ناخنوں سے دھیرے دھیرے ان کھرنڈوں کو صاف کر دیا۔ اب اندر سے سفید چکنی اور لال جلد نکل آئی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کے دل میں پھر انھیں چومنے کی خواہش بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ ایک طرح کی نفرت اور کراہت سے اس کا دل بھر گیا۔ اور جب اس کی ماں نے اس سے پوچھا

" یہ نشان کیسے ہیں ؟ "

تو اس نے بڑی نفرت سے جواب دیا
"ایک کتے کے دانتوں کے نشان ہیں۔"
اس کی ماں نے اسے ایک لمحے کیلئے غور سے دیکھا اور چپ ہو کر رہ گئی۔

* * *

اگلے بیس دنوں میں لاچی نے دماروکے ستر روپے ادا کر دیئے بھیک مانگ کے اور چوری کر کے، مگر اب دن پر دن اس کیلئے یارڈ سے کوئلہ چرانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اور مرغیاں ہر روز تو پکڑی نہیں جا سکتیں۔ ریلوے کوارٹروں والے بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ کیونکہ لاچی کا قصہ سارے علاقے میں مشہور ہو چکا تھا۔ جب کبھی وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف سے گزرتی تو حمیدا اس کی طرف گھور کے اپنے ساتھیوں سے کہتا۔
"وہ ساڑھے تین سو کی لونڈیا جا رہی ہے۔"
لاچی اگر اس پر بھی چپ رہتی تو کہتا۔
"ہم سے کہو تو ہم ساڑھے تین سو کیا ساڑھے تین ہزار اس کے قدموں پر لا کر پھینک دیں گے۔"
اگر اس پر بھی وہ خاموش رہتی تو وہ کہتا۔

" ہماری اگر سنے تو ہم ساڑھے تین ہزار کیا، ساڑھے تین لاکھ اُسے دلوادیں۔ چاہیں کسی فلم میں ہیروئن بنا دیں۔ مگر اپنی ایک شرط ہے۔"

اس پر تنگ آ کے لاچی اس کی طرف دیکھ کے تھوک دیتی اس پر ٹیکسی ڈرائیوروں کا گروہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑتا۔ اور لاچی غصے میں بھری ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی۔ اب اس نے ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنا بند کر دیا۔ کوئی ایک دو ہوتے تو ان کی باتوں کا جواب دے دیتی۔ مگر اب معاملہ اس قدر صاف تھا۔ شرط اس قدر کھلی ہوئی تھی کہ ہر کس و ناکس اس کا مذاق اڑانے پر تل گیا تھا۔ جس سطح کی زندگی لاچی گزارنے پر مجبور تھی، اس سطح پر اتر کر کوئی شخص یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ لاچی اپنے آپ کو بیچنے کیلئے اتنی شدت سے انکار کرے گی۔

۸

" ارے صاب! یہ خانہ بدوش لڑکیاں، نہ ان کا گھر نہ گھاٹ نہ ماں کا پتہ نہ باپ کا، کس برتے پر یہ کم بخت اتراتی ہے؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لاچی نے دمارو سے کوئی شرط نہیں لگائی ہے، سارے علاقے کی غیرت کو چیلنج کیا ہے۔ ہر وہ شخص بھی جسے اس سے پہلے لاچی میں کسی طرح کی دلچسپی نہ تھی۔ اب یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح لاچی اپنی شرط ہار جائے، اپنی عزت کھو دے، دل

کی بات زبان پر نہ آتی تھی لیکن اکثریت کی عزت کا تقاضا یہی تھا کہ اس ذلیل خانہ بدوش لڑکی کی عزت چھین جائے۔ یہ حرامزادی کیا کھا کے ہماری گھر کی عورتوں کی برابری کرنا چاہتی ہے؟

اس لئے اب بہت سے لوگ جو اس سے پہلے اس سے مذاق کیا کرتے تھے اور اپنا دل خوش کر کے اُسے دو چار آنے دے دیا کرتے تھے۔ اب دیدہ و دانستہ اُسے بھیک نہ دیتے تھے۔ کئی تو صاف صاف اور برملا اس سے کہہ دیتے۔

"بہار کے بعد دیں گے۔"

"وہ دن تو آنے دو، پھر دو آنے کیا، دو سو روپے لے لینا۔"

لاچی خوب جلی کٹی سناتی، وہ خوب مزہ لیتے، لیکن ایک پائی بھیک کی اُسے نہ دیتے۔ یہ علاقے کی عزت کا سوال تھا۔ اور عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ ہوتی ہے نا جی؟ آخر ایک گھر کی عورت میں اور ایک گلی گلی بھیک مانگنے والی، ٹوکریاں بُن بُن کر بیچنے والی خانہ بدوش لڑکی کی عزت میں کچھ فرق تو ہونا چاہیئے۔

ایک روز لاچی کوئلہ چراتے چراتے پھر مین موقع پر پکڑی گئی۔ ان دنوں یارڈ کے سنتری دن میں بہت چکر لگاتے تھے اور

خاص طور پر لاچی پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس لیئے لاچی نے دن کو کوئلہ چرانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ رات کی تاریکی میں کوئلے کے انبار پر چھاپہ مارتی تھی۔ یہاں سینکڑوں من کوئلہ رکھا تھا۔ چند سیر اس میں سے اگر کوئی چرا لے جائے گا تو کسی کا کیا بگڑ جائے گا؟ لاچی جس ماحول میں پلی تھی اس ماحول میں اتنی سی چوری کو وہ چوری نہ سمجھتی تھی۔ وہ تو دن دہاڑے کوئلہ چرا لیتی۔ مگر کیا کرے۔

پولیس کے سنتریوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کیسے کوئلے کے ڈھیر تک پہنچ جائے؟ رسک لال اسٹیشن ماسٹر نے تنگ آ کے حکم دیا تھا کہ اگر لاچی کبھی ریل کے یارڈ میں بھی داخل ہو تو اُسے فوراً گرفتار کر لیا جائے!

رات کی تاریکی میں آج جب لاچی کوئلہ چرانے کیلئے دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جب اس نے بہت سا کوئلہ اپنے دامن میں بھر لیا تو کسی نے آ کے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ لاچی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

اس نے دیکھا یارڈ کا سنتری دتو اپنے لمبے لمبے دانت نکوسے اس پر ہنس رہا تھا۔

"چھوڑ دے مجھے!"

"چل اسٹیشن ماسٹر کے پاس!"

"بخش دے مجھے!" لاچی نے بڑی لجاجت سے کہا "اب میں کوئلہ نہ چراؤں گی۔"

"چلتی ہے کہ میں لات جماؤں؟"

دتو نے رائفل کا ایک ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"ارے ہے کیا، چند سیر تو کوئلہ ہے۔ سب خانہ بدوش لڑکیاں لے جاتی ہیں، تیرے ریلوے کے کوارٹروں کے سارے نوکر لے جاتے ہیں۔ میں نے لے لیا تو کیا غضب کیا؟ خود اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں یہ کوئلہ جلتا ہے۔ میں جانتی نہیں ہوں کیا، میں نے کون سا ایسا غضب کر دیا ہے رے دتو۔"

"میں کچھ نہیں جانتا تجھے اسٹیشن ماسٹر کے پاس چلنا ہوگا۔"

"لے میں تیرا کوئلہ یہیں پھینکے دیتی ہوں۔"

لاچی نے کوئلوں سے بھرا دامن وہیں ڈھیر پر الٹ دیا۔

"اب تو مجھے جانے دے۔"

دتو نے خوف دلانے کیلئے رائفل سیدھی کی۔ بولا۔ "اگر نہیں چلے گی تو ابھی گولی مار دوں گا۔"

دھیرے دھیرے سر جھکائے لاچی دتو کیساتھ چلنے لگی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا، تین بجے گورنر صاحب کا اسپیشل اسٹیشن سے گزرنے والا تھا۔ اس لئے رسک لال ابھی تک گھر نہ گیا تھا۔ اسٹیشن کا سارا اسٹاف چوکس تھا اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر کیل کانٹے سے درست ہو کر کھڑا تھا۔

جب دتو لاچی کو لے کر رسک لال کے کمرے میں پہنچا تو اس وقت کمرے میں رسک لال کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ ٹیلیفون پر بیٹھا جنکشن سے گورنر صاحب کی اسپیشل کے بارے میں ہدایت حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دتو رام اور لاچی کی طرف دیکھا جو آج سہمی سہمی سی کھڑی ایک کونے سے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دتو کو نکل جانے کیلئے کہا۔ دتو کمرے سے باہر نکل کے کھڑا ہو گیا۔

جب رسک لال ٹیلیفون کر چکا تو وہ دھیرے سے لاچی کی طرف مڑا اور اس سے بہت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

ادہر آؤ ۔۔

لاچی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی بے بسی میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ رسک لال کا دل پگھل گیا۔

اس نے بہت نرمی سے کہا۔

" تُو تو بہت اچھی لڑکی ہے، پھر کیوں کوئلہ چُراتی ہے ؟ "
لاچی نے بڑی لجاجت سے کہا۔
" اسٹیشن ماسٹر صاب ! اب نہیں چُراؤں گی۔ اب بس معاف کر دو۔ "
" مگر ایسا کام کیوں کرتی ہے ؟ "
" تم تو جانتے ہو اسٹیشن ماسٹر صاب ! سارا علاقہ جانتا ہے۔ "
" وہی ساڑھے تین سو کا قصّہ ! ؟ "
" ہاں -! "
کہہ کر لاچی نے نگاہیں نیچی کر لیں۔
" کتنے روپے ادا کر چکی ہے ؟ "
" اسّی ! "

لاچی سر سے پاؤں تک ایسی شرمائی محجوب ندامت میں ڈوبی کھڑی تھی کہ رسک لال کو اس پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اپنے میز کے دراز کو دو ایک بار کھولا۔ بند کیا، کھولا، پھر بند کیا۔ آخر میں کھول کر کچھ نوٹ نکالے اور انھیں لاچی کے ہاتھ میں دے کر بولا۔
" لے، لے جا انھیں، اور دیدے اس خبیث کو۔ "
لاچی جیسے شکر کے بار سے دب گئی، جھک گئی۔ اس نے جھک

کر رسک لال کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ اور جونہی اُوپر اٹھی۔ وہ رسک لال کی باہوں میں تھی۔

رسک لال کے دبلے پتلے، بھوکے تر سے چہرے پر اس نے اس جذبے کی لرزش دیکھی، وہی رنگ، وہی ادا، وہی لالچ، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رسک لال کے بھیس میں مادھولال کپے پیتے کو دیکھ رہی ہے۔

وہ لجلجی سی چکناہٹ، وہی رینگتے ہوئے کیڑے کی سی کلبلاہٹ، لاچی کے دل میں وہی کراہت آمیز نفرت پیدا ہوئی رسک لال اس کے چہرے کیطرف جھکا ہی تھا کہ لاچی نے تڑپ کر ایک ہی جھٹکے میں رسک لال کی باہوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا اور اس کے گال پر ایک زور کا طمانچہ دیا کہ رسک لال کرسی سے ٹھوکر کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ اور زمین پر گرتے ہی چلّا کر شور مچانے لگا۔

"پولیس! پولیس!!"

دتّو فوراً دوڑتا ہوا اندر آیا۔

اسے دیکھ کر رسک لال کی دلیری عود کر آئی۔ وہ زمین سے اٹھا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا۔

"اِس حرامزادی کو حوالات میں لے جاکر بند کردو۔ یہ کم بخت کم بخت کو ئلہ چراتی ہے ہمارے یارڈ سے۔"

لاچی فوراً ترکی بہ ترکی بولی

"اور تم جو کچھ چرار ہے تھے مجھ سے، بڈھے، بھڑوے! شرم نہیں آتی، تیری بیٹی کے برابر ہوں۔"

"لے جاؤ، اسے لے جاؤ اور حوالات میں بند کردو۔"

رسک لال آگ بگولا ہو کے بولا۔

لاچی آگے بڑھ کے اپنے بازو چلاتے ہوئے بولی۔

"ٹھہر تو جا، ابھی تیری کھال نوچ لوں گی۔"

لیکن دتّو لاچی کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ اور اس نے لاچی کو اسٹیشن کے حوالات میں بند کردیا۔

تین دن حوالات میں رہنے کے بعد چوتھے دن حوالات کے سنتریوں نے لاچی کو اسٹیشن ماسٹر کے حکم سے حوالات سے باہر دھکیل دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جب لاچی حوالات کے باہر آئی تو کال اُسے لینے کیلئے کھڑا تھا۔

لیکن یہ گل کوئی دوسرا ہی گل تھا۔

اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر دھول اور گرد کے نشان تھے وہ پٹھانی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر سیاہ جاکٹ اور سر پر لنگی اور کلاہ اور سیاہ جاکٹ کے اوپر اس نے ایک چرمی بیلٹ پہن

رکھا تھا، جس سے بندھی ہوئی چقماق کی ایک چرخی اس کی بیٹھ پر آویزاں تھی۔ اور آگے پٹے کی گرہوں میں چاقو اور چھریاں اور قینچیاں لٹک رہی تھیں۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تُو نے؟" لاچی نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیوں نکال دیا ہے؟"

"جب میں نے تیرے لئے پیسے مانگے تو آغا جی بہت خفا ہوئے۔ بولے "بلوچ کا بیٹا ہو کر ایک آوارہ خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ میں تیرے لئے ساڑھے تین سو کیا، تین روپے بھی نہیں دے سکتا۔ نکل جا، اسی وقت نکل جا میرے گھر سے! یہ کہہ کر وہ اپنا ڈنڈا لے کر میرے پیچھے دوڑے، میں گھر سے بھاگ آیا۔"

"پھر اتنے دن کہاں رہے؟ اس دن پل پر کیوں نہیں آئے؟"

"کیا منہ لے کے آتا۔ سوچا تھا رقم اکٹھی کر لوں گا تو آ کے تمہاری ہتھیلی پر دھر دوں گا۔ اس کیلئے میں نے دو تین جگہ نوکری کیلئے کوشش بھی کی ادھر میونسپل کمیٹی میں ایک کلرک کی اسامی خالی تھی مگر وہ لوگ بولے۔

"تم ادھر کے باشندے نہیں ہو، تمہیں یہ نوکری نہیں مل سکتی کسی نے کہا تم پٹھان ہو، کسی نے کہا، تمہیں دیکھ کے ڈر لگتا ہے

اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اس موقع پر باندرہ والے عبدالصمد خاں نے جو ہماری برادری کا ہے، میری یہ مدد کی ہے اس نے مجھے اس دھندے پر لگا دیا ہے. دو ڈھائی روپے روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے تیرے لئے تیس روپے جمع کئے تھے۔ "

" کہاں ہیں وہ تیس روپے؟ "

لاچی نے خوش ہو کے ہتھیلی آگے بڑھائی.

گل نے سر جھکا کے کہا.

" وہ تو خرچ ہو گئے. "

" خرچ کر دیئے تو نے! " لاچی چیخ کر بولی.

" رسک لال کو دیدیئے نہ دیتا تو حوالات سے تجھے باہر کیسے نکالتا۔ "

لاچی پلیٹ فارم کے ننگے فرش پر بیٹھ گئی. سامنے یارڈ کی فولادی پٹریاں، بے روح، سنگدل اور جذبات سے عاری، ان پٹریوں سے پرے ریلوے کا جنگلا تھا، جنگلے سے پرے ریلوے کے کوارٹر تھے ــ کوارٹروں سے پرے خانہ بدوشوں کے خیمے تھے، خیموں سے پرے درختوں کی ننگی قطاریں تھیں۔ وہ تیز تلواروں کی طرح ننگی شاخیں جیسے اس کی گردن پر لٹک رہی تھیں۔ جس دن ان شاخوں پر پھول آئیں گے

جس دن ان شاخوں پر ـــ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان شاخوں پر پھول نہ آئیں۔ روپوں کے سفید سفید پھول کھلیں، جنھیں توڑ توڑ کر وہ دماروکا دامن بھر دے۔ ان شاخوں پر آخر پھول کیوں اُگتے ہیں ؟ روپے کیوں نہیں اُگتے ؟ صرف ایک ہی بہار میں ایسا ہو جائے ۔

لاچی دھیرے سے اٹھی اور یارڈ سے گزرنے لگی۔ گل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دونوں کے قدم بے اختیار پرانے پل کیطرف بڑھنے لگے پل کے اوپر پہنچ کر وہ دونوں ناامید اور مایوس ہو کر خلا میں دیکھنے لگے

وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

کہیں بھی کچھ نہ تھا۔

گل نے اپنی مٹھیاں کس لئیں۔ بولا ۔

" ابھی بہار میں بہت دن ہیں۔ میں ہولے ہولے تیرا سارا قرضہ چکا دوں گا ۔ "

" مجھے ان ننگی شاخوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ روز صبح اُٹھ کر اُنہیں دیکھتی ہوں، کہیں ان میں سے آنکھیں تو نہیں نکل آئیں، کہیں ان میں کوئی پتی تو نہیں پھوٹی ؟ کہیں کوئی کلی تو نہیں شرمائی ؟ مجھے بہار کی آمد سے بہت ڈر لگتا ہے ۔ "

" خدا کرے بہار کبھی نہ آئے ۔ "

گل نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا ۔

وہ دونوں چپ ہو گئے ۔

یکایک گل ہنسنے لگا ۔

" کیوں ہنستے ہو ؟ "

لاچی اس کیطرف حیرانی سے دیکھ کر بولی ۔

" ان دنوں میں بھی بے ایمانی کرتا ہوں ۔ "

" کیا بے ایمانی کرتے ہو ؟ کوئلہ چراتے ہو ؟ "

" نہیں ، جب میں گھروں میں جاتا ہوں اور لوگ مجھے اپنے چھریاں تیز کرنے کیلئے دیتے ہیں تو میں انھیں صرف ایک طرف سے تیز کرتا ہوں ۔ "

" کیوں ؟ "

" تاکہ چھریاں چاقو جلد کند ہوں اور وہ لوگ پھر میرے پاس آئیں ۔ "

لاچی زور زور سے ہنسنے لگی ۔

اُسے گل کی یہ شرارت بہت پسند آئی ۔ یکایک گل اُسے اپنا ہی ساتھی ، اپنی ہی طرح کا ایک آدمی محسوس ہوا ۔ وہ اپنی دھن میں اس کے قریب چلی گئی ۔ ہنستے ہنستے یکایک رُکی ۔ بولی

" اپنا ہاتھ دکھاؤ ! "

گل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

لاچی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اپنے ہاتھوں سے اُسے دبایا۔ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں کچھ فرق پڑا ہے۔"

"کیا فرق پڑا ہے؟"

گل نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلے یہ ہاتھ نرم تھے، اب سخت ہو گئے ہیں۔"

گل چپ رہا۔

لاچی نے اس کے چہرے کیطرف دیکھا۔ بولی

"اب تمہارے چہرے پر مٹی ہے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی ہے بابوؤں کیطرح تمہارا چہرہ صاف اور چمکیلا نہیں رہا۔"

گل نے احتجاجاً کہا۔

"کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے، دن بھر گھومنا پڑتا ہے۔ اب میں کل شیو کر کے آؤں گا۔"

"شیو کر کے مت آنا۔" لاچی سختی سے بولی۔ "مجھے تمہارا یہ اُلجھا ہوا، بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ پسند ہے۔"

گل کا ہاتھ لاچی کے ہاتھ میں کانپا جیسے پرندہ انجانے گھونسلے

میں آشیانے کے تنکے ٹٹولے اور گھونسلے کو آرام دہ پاکر اپنے پر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ اسیطرح گل نے اپنے ہاتھ کو لاچی کے ہاتھ میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے دل میں ایک میٹھی سی لہر کہیں سے آئی۔ اور اس کی روح کے ذرے ذرے کو نغمے اور سرور سے شاداب کرتی چلی گئی۔ اور ایک سکون آمیز طمانیت سے اس کا دل سرشار ہو گیا۔ لاچی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس کی طرف مڑی اور اس کیطرف متجسّس نگاہوں سے دیکھ کر بولی:

"گل ـــ!"

"ہاں۔"

"تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟"

"ہاں۔"

"مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں۔"

"مجھے ایک گھر دو گے؟"

"ہاں۔"

"تم میرے لئے بس کے کیو میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو گے؟"

"ہاں! مگر تم یہ سب کیوں پوچھتی ہو؟"

"بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے!" لاچی ایک گہری طمانیت کی آہ بھر کے بولی۔ "اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

لاچی کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور وہ بے اختیار گل کے سینے سے جا لگی۔

گل نے گھبرا کے کہا۔

"سارا یارڈ دیکھ رہا ہے لاچی! سارا یارڈ دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھے، سارا یارڈ کیا، ساری دنیا دیکھے، میں تیری ہوں۔"

لاچی نے مکمل طمانیت سے کہا اور اس کے بازو گل کے گلے میں حمائل ہو گئے۔

گل نے جھک کر لاچی کی آنکھوں کی سبز جھیلوں میں دیکھا۔ وہاں دُور دُور تک مسرت کے کنول کھلے تھے۔

گل نے لاچی کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کے ہونٹ لاچی کے کنوارے ہونٹوں پر جھک گئے۔

پُل کے نیچے نغفتین ڈاون شور مچاتی ہوئی، گڑگڑاتی ہوئی گزرنے لگی۔ اس کی سیٹی کی دلکش آواز لاچی اور گل کے دلوں میں مسرت کی گھنٹیاں بجاتی ہوئی گونجتی گئی۔ کُورو ..... کُورو ..... جیسے چہکتی ہوئی کوئل فضا میں لہرا کے گزر جائے۔

ہری جھنڈی ملی، سگنل اٹھے اور محبت میں بے بس عورت کے بازوؤں کیطرح گر گئے۔ کانٹے والے نے کانٹا بدلا اور عورت کی روح اپنی پرانی لائن کو چھوڑ کر نئی لائن پر بھاگتی چلی گئی۔ نیا سفر، نئی منزل، نئے راستے، ان بوجھے، ان جانے راستے، جو زندگی کی نئی وادیوں کو جاتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اِس واقعے کے پندرہ بیس روز بعد ایک آسمانی رنگ کی پلائی متھ دمارو کے خیمے کے قریب کی سڑک پر رکی جو ائرپورٹ کو جاتی تھی۔ اس میں سے نیم بھورے رنگ کا ریان جھلملاتا ہوا سوٹ پہنے ایک بانکا جوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تھری کاسل کا ڈبہ تھا۔ انگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اور ٹائی پر بھی ایک لعل جگمگا رہا تھا۔ دمارو نے اُسے جھک کر سلام کیا۔

نوجوان نے دمارو سے پوچھا

"ابھی اور کتنے دن مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"بہار آجائے!" دمارو نے بڑی حسرت سے درختوں کی ننگی شاخوں کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہار تو دو ماہ میں بھی نہ آئے گی۔"

"نہیں بابو! اب کے بہار جلد آئے گی۔"

"تب تک وہ شاید سارے پیسے چکا دے گی۔"

"کیسے چکا دے گی۔ یہ ناممکن ہے بابو۔ ان بیس دنوں میں اس نے مجھے صرف پچاس روپے دیئے ہیں۔"

"لیکن وہ ادا کر دے گی۔ حمید امجھ سے کہتا تھا۔ چاقو چھریاں تیز کرنیوالا ایک پٹھان ہر روز اُسے پیسے دیتا ہے۔ وہ روز رات کو پل پر ملتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں بابو۔"

"تم خاک جانتے ہو۔" وہ نوجوان جھلّا کے بولا۔ "سالی دو پیسے کی چھوکری اور اتنی اکڑفوں۔ تم سے کچھ نہیں ہوتا تو مجھ سے صاف کہہ دو۔ سالی پر غنڈے چھوڑ دوں گا۔ دو منٹ میں اُسے اغوا کر کے میرے پاس پہنچا دیں گے۔ ذرا سی تو بات ہے۔"

"اب دیر بھی ذرا سی ہے بابو۔" دمارو لجاجت سے بولا "بہار کو آنے دو۔ یہ شگوفہ خود بخود کھل جائے گا۔"

"بس باتیں ہی باتیں ہیں تمہاری۔" نوجوان چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔ اور اپنی کار کیطرف جانے کیلئے مڑا کہ دمارو تے آگے بڑھ

کراس سے بھکاریوں ایسے لہجے میں کہا۔

"ایک سو روپے دے جاؤ۔"

"اب تک چار سو روپے مجھ سے تم لے چکے ہو۔"

"بس ایک سو اور دے جاؤ۔ پھر بہار آنے تک کبھی نہ مانگوں گا۔

صرف ایک سو روپیہ!"

نوجوان نے اپنا بڑا چرمی بٹوا کھولا۔ اس میں سو سو کے نوٹ ہزاروں کے ہوں گے۔ دمارو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ نوجوان نے بہت بے پروائی سے اس میں سے ایک نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دمارو گھٹنوں تک بارِ احسان سے جھک گیا۔ نوجوان نے دمارو کے فرشی سلاموں کا کوئی جواب نہ دیا اور بہت نخوت سے سگریٹ پیتا ہوا اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

دمارو جب سو کا نوٹ لیکر خوش خوش اپنے خیمے کو گھوما تو اس نے اپنے سامنے رگی کو کھڑا پایا۔ رگی کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ دمارو نے اُسے دیکھ کر جلدی سے سو روپے کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور رگی سے

نگاہیں چرا کر اپنے خیمے کو جانے لگا کہ رگی نے اس کا راستہ روک لیا۔

"کیا ہے؟" دمارو نے بڑی کرختگی سے کہا۔

"یہ کون تھا؟" 150

"چمن بھائی تھا، کرلا روڈ پر اس کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے۔"

"اس نے تمہیں سو روپے کا نوٹ کیوں دیا؟"

"یہ میرا اس کا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟"

"میں سب سمجھتا ہوں، میں نے سب سن لیا ہے۔ اب میرا حصہ نکالو، میری بیٹی کا سودا کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟"

رگی نے دمارو کا گریبان پکڑ لیا۔

"ارے چلّا مت!" دمارو نے بہت چالاکی سے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں حصہ بھی دیتا ہوں اور حصہ سے بھی زیادہ دیتا ہوں۔"

"تو دو۔"

"میرا گریبان تو چھوڑ دو۔"

رگی نے ہاتھ پرے ہٹا لیا۔

دمارو نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے دس کا ایک

نوٹ نکالا۔ بولا۔

" یہ لو دس روپے اور دس روپے اور دوں گا اگر تم میرا ایک کام کر دو گے۔"

"کیا کام ہے؟"

دمارو نے غور سے رگی کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی ہمارے قبیلے ہی میں رہے؟"

"ہاں!"

"وہ کسی ایک گاؤں، کسی ایک شہر، کسی ایک مرد کی ہو کر نہ رہے۔"

"ہاں!"

"تو تمہیں میرا کام کرنا ہی ہو گا، میں تمہیں اس کے دس روپے دوں گا۔"

"وہ کام کیا ہے، پہلے یہ تو بتاؤ؟"

"اِدھر میرے قریب آؤ۔"

رگی دمارو کے قریب گیا۔ دمارو نے جھک کر رگی کے کان میں کچھ کہا۔ کچھ دیر تک رگی کا چہرہ دمارو کی بات سن کر پریشان اور متوحش رہا۔ پھر یکایک اس کا چہرہ صاف اور روشن ہو گیا۔ اور اس نے دمارو سے کہا۔

"اس کام کے تیس روپے ہوں گے ۔"

"تیس زیادہ ہیں۔ میں پندرہ دیدونگا ۔"

بڑی ردّوکد کے بعد پچیس پر سودا ہو گیا ۔

رگی نے کہا ۔ "نکالو پچیس روپے ۔"

"ابھی نہیں ۔" دمارو ہنس کے بولا ۔ "میرے یار اپنا کام کرو ۔ پچیس روپے لے جاؤ ۔ اگر میرا اعتبار نہ ہو تو کہو مامن کے پاس رکھوادوں ۔"

"نہیں، مامن حرامزادے سے تم حرامزادے بہتر ہو ۔" رگی نے مسکرا کر کہا اور دس روپوں کو جیب میں ڈال کر گنگناتا ہوا چلا گیا ۔

* * *

آج لاجی نے صرف بارہ آنے کمائے تھے ۔ سوا روپیہ گل سے لا کے دیا تھا ۔ اس طرح دو دو روپے کر کے کتنے مہینوں میں قرضہ چکایا جا سکے گا ۔ لاجی بار بار خائف ہو کر درختوں کی طرف دیکھتی ــــ درختوں کی چھال کا رنگ بدل رہا تھا ۔ بھورے بھورے ڈالوں پر ہری لچکیلی شاخیں پھوٹی تھیں ۔ چند دنوں میں ان پر نرم نرم سبز پتیاں پھوٹیں گی ۔ پھر سبز پتیوں کے لرزتے ہوئے جھوم میں لال لال شگوفے پھوٹیں

گے اور گویا میری قسمت پھوٹ جائے گی۔ لاچی کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

گل نے اُسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

" گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں وقت سے پہلے روپیہ چکا دوں گا۔ دن رات محنت کرتا ہوں ایک فلم اسٹوڈیو میں دربان کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ مالک نے مجھے کل بلایا ہے۔ پچھتر روپے تنخواہ ہوگی۔ شام کے چھ بجے چھٹی ہوگی۔ چھٹی ہوتے ہی میں چقماق کی چرخی لے کر گھومنا شروع کر دوں گا۔ کچھ یہاں سے آئے گا۔ کچھ وہاں سے آئے گا۔ روپے آ جائیں گے۔ قرضہ چک جائے گا۔"

لاچی کی بشاشت واپس آ گئی۔ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

" پھر — پھر — ؟ "

" پھر ہم اپنا گھر بسا لیں گے، باندرہ والے عبدالصمد خاں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ مجھے باندرہ میں ایک کھولی دلا دے گا۔ ہم دونوں اس میں رہیں گے۔"

" ہم دونوں ؟" لاچی جیسے خوشی سے چیخ کر بولی۔ " میرا گھر۔"

" مگر چھوٹا سا گھر ہوگا — ہائے میرا گھر۔"

لاچی ایک دم گل کے سینے سے لگ کر بولی۔ اس کا ننھا سا

دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

" ہائے جب تو سچ مچ بہار آ جائے گی، سچ مچ بہار آ جائیگی۔"

" اچھا تو میں جاؤں۔ رات کو پل پر آؤں گا۔"

لاچی آزردہ ہو کے بولی

" تم ہر روز یہاں سے پیدل باندرے جاتے ہو۔ وہاں سے پیدل رات کو پل پر واپس آتے ہو۔ صرف مجھے دیکھنے کیلئے یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔"

لاچی نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے چار آنے نکالے اور اُسے گل کو دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

" بس کا کرایہ آنے جانے کا تو لے جاؤ۔"

" نہیں لاچی! " گل نے بہت نرمی سے کہا۔ " تم یہ چار آنے بھی دمارو کو دیدو۔ قرضے میں سے چار آنے اور کم ہو جائیں گے۔ یہ تو سوچو۔۔"

" لیکن تم کتنے تھک جاتے ہو۔"

گل ہنس کر بولا۔ " جب تم میرے گھر آ جاؤ گی پھر تم میرے پاؤں دبا دیا کرنا۔ میری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

" پھر میں تمھارے پاؤں دباؤں گی، تمھاری ٹانگیں دباؤں گی۔

تمہاری پیٹھ، تمہاری کمر، تمہارے ہاتھ، تمہاری گردن، تمہارا سر دباؤں گی۔
تمہارے جسم کے گوشے گوشے سے ساری تھکن اپنی بانہوں میں لے
لوں گی۔ میرے گل۔ میرے گل ۔۔!!"

لاچی نے گل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اپنے
سینے پر جھکا لیا۔

گل نے لاچی کو پیار کیا، پھر اس نے وہ چار آنے لاچی کی جیب
میں ڈال دیئے۔ اور رات کو پل پر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اِن دنوں لاچی مامن اور اپنی ماں سے زیادہ باتیں نہ کرتی تھی۔
اتنے قریبی رشتے میں اجنبیوں کا سا رکھ رکھاؤ آگیا تھا۔ کم سے کم باتیں ہوتی تھیں اور غیریت کے پردے میں ہوتی تھیں۔ لاچی اپنے خیمے میں پہنچتی تھی اور پہنچتے ہی مامن اور اپنی ماں کیلئے کھانا پکاتی تھی۔ برتن صاف کرتی خود کھانا کھاتی، پر جب سونے کا وقت آتا۔ چٹائی لے کر خیمے کے اندر سو جاتی۔ رات کے دو بجے تک یا تو جاگتی رہتی یا اگر سو جاتی تو رات کے دو بجے خود بخود اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بھاگ کر پل پر پہنچتی۔
آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دور ہی سے اس نے دیکھ لیا

کہ پل پر رات کی تاریکی میں ایک دھندلا دھندلا سا سایہ کھڑا ہے۔ محبت سے اور شوق سے اس کے قدم تیز ہو گئے اور وہ جلدی جلدی پل کے اوپر پہنچی لیکن وہاں پہنچ کر جب وہ سایہ اس کی طرف مڑا تو وہ اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

یہ گل نہ تھا۔

دبلے پتلے بدن والا، سوکھے سوکھے گالوں والا، چھوٹے نلے قد کا، کانٹے والا رامو تھا۔

" رامو !" لاچی زور سے چلائی۔ "تم یہاں کیسے ؟" پھر وہ ایک دم گھبرا کے بولی۔

" گل کہاں ہے ؟ "

" ہسپتال میں ہے۔ "

رامو رکتے رکتے بولا۔

" ہسپتال میں ؟ " لاچی حیرت سے بولی۔ پھر اس کی زبان خود بخود بند ہو گئی۔ وہ آگے کچھ بول نہ سکی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رامو کو دیکھنے لگی۔

رامو آہستہ سے بولا۔

" وہ یہاں سے باندرے پیدل جا رہا تھا، ارلا کے موڑ پر، جہاں سڑک کے کنارے کنارے بڑے بڑے آدمیوں کے بنگلے ہیں اور بہت بڑے

بڑے بچاڑ ہیں۔ ادھر سے ایک آدمی نکلا اور اس نے پیچھے سے آکے چھرا
گل کی پیٹھ میں بھونک دیا۔

"ہائے!"

لاچی نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔

"گل نے اُسے پکڑنا چاہا۔ مگر رات کی تاریکی میں وہ آدمی اپنا
دامن چھڑا کر اس سے بھاگ کر درختوں میں گم ہو گیا۔ گل خون میں لت پت
سڑک پر لوٹنے لگا۔

اتفاق سے میں اسی وقت اپنے گھر جا رہا تھا۔ میں ارلا میں
رہتا ہوں نا، جھونپڑیوں میں، جدھر بجلی والوں کا دفتر ہے۔ اس کے پیچھے
میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ راستے میں میں نے کسی کے کراہنے کی آواز
سنی۔ پلٹ کے دیکھا تو گل تھا۔ زمین پر لوٹ رہا تھا۔ میں نے اُسے
اُٹھایا۔ راستے میں گزرتی ہوئی ایک لاری کو روکا۔ اور اب اُسے باندرے
کے ہسپتال میں پہنچا کے اِدہر تمہاری طرف آیا ہوں۔ مجھ سے گل نے
کہا تھا، تو مجھے یہاں ملے گی۔"

لاچی نے گھبرا کے پوچھا

"اس کا کیا حال ہے؟"

راموبولا۔ "اس کے جسم سے خون تو بہت گیا ہے مگر

ڈاکٹر بولتے تھے وہ بچ جائے گا۔ "

" تو مجھے جلدی سے ہسپتال لے چل۔ "

رامو تھوڑی دیر کیلئے جھجکا۔

پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس میں سے پندرہ روپے نکال لے اور انہیں لاچی کو دیتے ہوئے بولا۔

" انہیں اپنے پاس رکھ لے۔ "

" کاہے کیلئے ؟ "

لاچی حیران ہو کے بولی۔

رامو نے سر جھکا کے کہا:

" مجھے تیرا قصّہ معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں، عجّت کیا ہوتی ہے میری بھی ایک لڑکی تھی تیری اتنی بڑی۔ ایک دن رسک لال نے اس کی عجّت لے لی تھی۔

وہ چپ ہو گیا۔

دیر تک چپ رہا۔ پھر رندھے ہوئے گلے سے بولا۔

" نہیں لیتا تو میری نوکری جاتی تھی ...... "

وہ پھر چپ ہو گیا۔

پھر بہت آہستہ سے، بہت دھیرے سے بولا۔

"میں جانتا ہوں عجت کیا ہوتی ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔

شرم سے جیسے زمین میں گڑ گیا۔

"نہیں نہیں، میں یہ روپے نہیں لوں گی" لاچی آبدیدہ ہو کر بولی۔ "تیری لڑکی کہاں ہے؟"

"کنوئیں میں ڈوب کر مر گئی۔"

رامو منہ پھیر کر خلا میں دیکھنے لگا۔

لاچی دم بخود رہ گئی۔ کتنا بڑا خلا ہے اس دنیا میں، کتنا بڑا کنواں کتنا گہرا، کتنا سیاہ، کتنا اندھا ہے یہ دنیا کا کنواں! ہر روز ہزاروں عورتیں اس میں ڈوب کر مر جاتی ہیں اور پھر بھی یہ بھو کا کنواں نہیں بھرتا۔

یکایک رامو نے لاچی کا دامن پکڑ کر کہا۔

"میں تجھے اگلے مہینے کی تنخواہ پر دس روپے اور دوں گا۔ مگر دیکھنا — کبھی — کبھی اپنی عجت نہ بیچنا۔"

لاچی کا دل چاہا کہ وہ بڈھے رامو کے شانے پر سر رکھ دے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اسے بالو، بالو کہہ کر پکارے لیکن اس نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا اور آہستہ سے بولی

"مجھے ہسپتال لے چلو۔"

گل کو ہسپتال میں ڈیڑھ ماہ کے قریب رہنا پڑا۔ دھیرے دھیرے اس کا زخم مندمل ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے اس کے دل کا زخم کھلتا گیا۔ وہ ہر لحظہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ہر لحظہ بہار قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ بستر پر پڑا تھا۔

لاچی ہر روز ہسپتال آتی۔ دونوں وقت جب ہسپتال، تیمارداروں کیلئے کھلتا تھا۔ اور وہ اس کیلئے اپنی کمائی میں سے پھل خرید کے لاتی تھی۔ اس نے سبزی مارکیٹ میں سبزی بیچنے والی ایک بڑھیا کے ہاں نوکری کر لی تھی۔

بڈھی کمزور ہو چکی تھی اور اب اس سے سبزی کی ٹوکری سر پہ اٹھا کے گلی گلی گھوما نہ جاتا تھا۔ لیکن اس کے لگے بندھے گاہک تھے۔ جو اُسی سے سبزی خریدنا پسند کرتے تھے۔ اور بڈھی کا گھر بھی اسی سبزی بیچنے سے چلتا تھا اور پھر اس کے گاہک اُسے وقت پر پیسہ دیتے تھے۔

اس لیئے اُس نے لاچی کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا اور ہر روز اپنی آمدنی میں سے ایک تہائی اُسے دینے لگی۔ اسی کاروبار سے لاچی کو ہر روز سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ مل جاتا تھا۔ مگر اتنے کے تو گل کے پھل ہی آ جاتے تھے۔ دماروں کو دینے کیلئے کچھ نہ بچتا تھا

کبھی کبھی تو بس کے آنے جانے کا کرایہ بھی بھاری پڑ جاتا. اس وقت لاچی بھی وہی کرتی تھی جو کبھی گل کا شیوہ تھا، کیونکہ شیوۂ عاشقی میں مرد اور عورت کی تفریق کہاں؟ اپنے محبوب کیلئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے.

لاچی کو اس کاروبارِ عشق میں ایک نئی لذت محسوس ہوئی. گل جب تک تندرست تھا. کبھی لاچی کو اتنا اچھا نہ لگا، جتنا بیمار ہو کر، اب تو ہر لحظہ وہ یہی چاہتی تھی کہ ہر وقت اپنے بیمار محبوب کے قدموں میں بیٹھی رہا کرے. مگر ہسپتال کے بھی قانون اور قاعدے ہوتے ہیں. گو لاچی کی دلربا صورت دیکھ کر اکثر اردلیوں کو رحم آجاتا ہے.

کمپاؤنڈر اور ڈاکٹر لوگ بھی اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے جب وہ آتی تو اردلی جیسے بچھ سے جاتے، ڈاکٹر وارڈ میں دو تین بار چکر لگاتا. اور کبھی ڈیوٹی ڈاکٹر کے ساتھ تین چار ڈاکٹر اور بھی آجاتے. بظاہر وہ کوئی دلچسپ کیس دیکھنے آتے تھے.

لیکن ہسپتال کی نرسوں کو بخوبی معلوم تھا کہ اصل دلچسپی کہاں پر مرکوز ہے. اس لئے ہسپتال کی نرسیں لاچی سے بہت جلتی تھیں. اگر ڈاکٹر اِدھر اُدھر کہیں موجود ہوتا تو لاچی کو اوور ٹائم بیٹھنے دیتیں. لیکن ڈاکٹر کے دور ہوتے ہی وہ اسے تحکمانہ انداز میں وارڈ سے باہر چلے جانے کا حکم دیتیں. لاچی سب سمجھتی تھی. کس کس ہمدردی کے پس پردہ کون سا جذبہ

جھانک رہا ہے۔ کسی کے نفرت انگیز سلوک کے پیچھے کون سی جلن پنہاں
ہے؟ وہ سب سمجھتی تھی، اس لئے برداشت کر لیتی تھی۔ دھیرے
دھیرے اس نے اپنی گرم، لاوا ایسی طبیعت پر جبر کرنا اور جبر کر کے
ایک معاف کر دینے والی مسکراہٹ سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔
کیونکہ جب انسان کسی جذبے کی ماہیت اچھی طرح سے سمجھ لے۔ تو
برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی اثنار میں ایک دن بلوچی، گل کا باپ صبح سویرے لاچی
کے جھگے پر پہنچا۔ جب لاچی سبزی مارکیٹ میں کام پر جانے والی تھی
لاچی اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

بلوچی بولا۔

"مجھے تم سے کچھ کام ہے۔"

لاچی نے کہا

"مجھے فوراً ہی سبزی مارکیٹ پہنچنا ہے۔ اس وقت میں رُک
نہیں سکتی۔"

بلوچی نے کہا۔

"چلتے چلتے باتیں کر لیں گے۔"

لاچی چلتی رہی۔ بلوچی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ لاچی اُس

ل باتیں سننے کیلئے بلمے راستے سے ہولی۔ جو یارڈ کے باہر گھاس کے گھٹوں کے گودام اور کرلا روڈ کو جانے والی بسوں کے شیڈ کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ جہاں قریب میں ایک سینما پڑتا تھا اور سینما کے عین سامنے ریلوے کا کراسنگ تھا۔

دونوں نے چلتے چلتے خاموشی سے آدھا راستہ طے کر لیا۔

آخر لاچی بولی۔

" تم کچھ بات کرنے آئے تھے ؟ "

" تم گل کو چھوڑ دو۔ "

یکایک بلوچی کے منہ سے نکلا۔

" کیوں چھوڑ دوں ؟ "

" وہ میرا بیٹا ہے ! " بلوچی تحکمانہ انداز میں بولا۔

" وہ میرا پیار ہے۔ "

لاچی بڑی نرمی سے سر جھکا کے بولی۔

" اگر تم اس سے شادی کرو گی تو ساری برادری مجھ پر تھو تھو کرے گی۔ "

" ایک برادری میری بھی تو ہے۔ "

" تم خانہ بدوشوں کا کیا اعتبار، آج یہاں، کل وہاں، تم

یہاں سے چلی جاؤ گی تو میرا بیٹا تمہیں بھول جائے گا۔"

لاچی خاموشی سے چلتی رہی۔

بلوچ نے اپنی جیب سے ساڑھے تین سو روپے نکالے۔

"یہ لے لو اور میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔"

"نہیں نہیں۔" لاچی بڑی تیزی سے بولی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

"پچاس اور دیتا ہوں۔"

بلوچ نے پچاس روپے اور نکالے، نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔

لاچی نے ان نوٹوں کیطرف دیکھا بھی نہیں اور ہاتھ سے اُسے جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

بلوچ نے تیزی سے آگے بڑھ کے اُسے روک لیا۔

"سنو سنو!" وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم مجھ سے شادی کر لو۔"

"تم سے شادی۔؟"

لاچی ہکابکا رہ گئی۔

"ہاں! میں، میں تمہیں خوش رکھ سکوں گا۔ گل کی صحت

دیکھو اور میری صحت دیکھو ۔" بلوچی اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ " میں تمھیں خوش رکھ سکوں گا۔ میرے پاس روپیہ بھی ہے بہت سارا روپیہ، اور جب سے ہسپتال میں میں نے تمہیں دیکھا ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

یکایک لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔

ہنسی اُسے بے اختیار آ رہی تھی۔

" کیوں ہنستی ہو ؟ "

بلوچی برافروختہ ہو کے بولا۔

" اس لئے ہنستی ہوں کہ میں باپ اور بیٹے میں سے صرف ایک کیساتھ شادی کر سکتی ہوں۔"

" تو مجھ سے شادی کر لو۔" بلوچی بہت بیتابی سے بولا۔

" میں حق مہر کیلئے پانچ ہزار روپے لکھنے کیلئے تیار ہوں۔"

بیقرار ہو کر بلوچی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گہرے طنز آمیز لہجہ میں بولی۔

" تم اپنے بیٹے کی رضامندی مجھے لے دو۔ پھر میں تم سے کیا تیرے دادا سے بھی شادی کر لوں گی۔"

یہ کہہ کر لاچی بہت تیزی سے اس کے پاس سے گھومی۔

اور دوڑ کر ریلوے کراسنگ پر قلانچیں بھرتی ہوئی نکل گئی۔

"سالی!" بلوچی نے دانت پیس کر کہا۔ "تجھ پر کُتّے نہ چھڑوا دوں تو احمد یار خاں نام نہیں۔"

لاچی نے سن لیا۔ اور وہیں کراسنگ سے پلٹ کر بلند آواز میں بولی۔

"پہلے برادری سے پوچھ لینا خان۔"

پھر وہ ہنستی ہوئی سبزی مارکیٹ کیطرف چلی گئی۔

اُسے بلوچی کی باتوں میں بے حد مزہ آیا تھا۔ آج وہ دن بھر ان باتوں کو یاد کر کے سبزی کا بوجھ اُٹھائے گھومے گی۔ یہ پچاس برس کے بعد لوگ کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں۔

رسک لال ہوں یا احمد یار خاں، اِن کی ایک ہی رگ ہے زبان پر پند و نصائح کے دفتر، نگاہوں میں وہی بے بس لالچی حرص! وہی پیاری سی مجبور، ہوس، بڈھے ہو کر مرد کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔

لاچی نے سوچا، ورنہ میں ضرور ان پر ایک کتاب لکھتی۔ "میری گلی کے بڈھے۔"

شام کو جب لاچی ہسپتال میں گل سے ملنے گئی۔ تو

اس نے گل سے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔

اس روز بلوچی بھی اپنے بیٹے کو دیکھنے کیلئے نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی دن تک نہ آیا۔ پھر ایک روز پتہ چلا کہ بلوچی اپنی بیٹھک بند کر کے پونا چلا گیا ہے۔ اور اس نے اب وہاں سے اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے۔

ڈیڑھ ماہ کے عرصے کے بعد جب لاچی گل کو ہسپتال سے لیکے آئی تو خانہ بدوشوں کے خیموں کی قطاروں کے باہر درختوں کی قطار پر پتیاں پھوٹی ہوئی تھیں، اور ان میں نرم نرم اور نوخیز کلیاں جھانک رہی تھیں۔ دمارو نے ان کلیوں کو بہت غور سے دیکھا۔

"دو ایک دن میں یہ کلیاں شگوفے بن جائیں گی۔ پھر میری زندگی میں بہار آجائے گی، اب تو ایک رات کی بات ہے یا شاید دو رات کی بات ہے۔"

"ان کلیوں کو آگ لگ جائے گی۔" لاچی اپنے منہ سے

شعلے اگلتے ہوئے بولی ۔ "یہ شگوفے کبھی نہ کھلیں گے اور کھلیں گے تو انگارے بن کر تیرا منہ جھلس دیں گے ۔"

دمارو زور سے ہنسا ۔

لاچی وہاں سے بھاگ گئی ۔

ان سندر سندر اٹھتی ہوئی کلیوں کا نوخیز جوبن اُسے کھائے جا رہا تھا ۔

رات کو وہ دونوں پھر اسی پرانے پل پر تھے ۔ وہ اور گل ! آج آسمان تاریک تھا ۔ یہی تاریکی ان کے دلوں پر بھی مسلّط تھی ۔ رہ رہ کر آسمان پر بجلی کوندتی تھی ۔ لیکن ان کے دل میں کسی طرح کی روشنی نہ تھی ۔

گل نے آہ بھر کے کہا

" اب تم کیا کرو گی ؟ "

لاچی سیدھے سپاٹ لہجے میں بولی ۔

" ہم ہار گئے ، وعدہ وعدہ ہے ۔ "

" یہ بے ایمانی اور بد اخلاقی کا وعدہ ہے لاچی ! تم اِسے پورا نہیں کرو گی ۔ "

" خانہ بدوش لڑکی اپنی زبان سے نہیں پھرتی ۔ " لاچی نے سر جھکا کے جواب دیا ۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈے چلے آ رہے تھے ۔"

"تم میرے ساتھ چلوگی!" گل نے پرامید لہجے میں کہا۔ "تم میرے ساتھ چلوگی لاچی! یہ دنیا بہت وسیع ہے۔ ہم کسی دوسرے شہر میں پناہ لیں گے، اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔"

"گھر —!"

لاچی ہولے ہولے سسکنے لگی۔ گل نے اُسے اپنی باہوں میں لے لیا۔

"ہاں یہی تو گھر ہے!" لاچی نے ایک بار اپنی آنکھیں بند کرکے اپنے دل سے کہا۔ "اِنھیں باہوں میں تو میرا گھر ہے یہیں سکون ہے، یہیں آرام ہے، یہیں میرا مستقبل ہے۔ یہیں میرا مستقبل ہے۔ یہیں پھول کھلتے ہیں، یہیں کوئی شب و روز کسی کا انتظار کرتا ہے۔"

"گل، گل! میں مرجاؤں گی مگر اپنے وعدے سے نہیں پھرونگی۔"

یکایک لاچی اس کی باہوں سے نکل گئی اور پل کی ریلنگ پر جھک کر رونے لگی۔ ٹپ ٹپ اس کے آنسو نیچے ریل کی فولادی پٹڑیوں پر گرنے لگے لیکن آنسوؤں نے فولاد کو کب گلایا ہے۔"

گل کی خالی باہیں گر گئیں۔ بے بس اور مجبور ہو کر اُس نے

پل کی آہنی ریلنگ کو ٹھوکر ماری اور بولا۔

"یہ بیکار، بے ہنگم دقیانوسی پل یہاں کیوں کھڑا ہے یہ پل جو کہیں جاتا نہیں، کسی کو کسی سے ملاتا نہیں، یہ ظالم پل ٹوٹ کیوں نہیں جاتا۔"

ٹھوکر کھا کر ریلنگ کی آہنی سلاخیں زور سے جھنجھنا اٹھیں اور ان کی گونج دیر تک فضا میں قہقہے لگاتی رہی۔ جیسے کوئی ان دونوں پر ہنس رہا ہو۔"

"یہ پل ہماری محبت کیطرح ہے جو کہیں نہیں جاتی۔" لاچی کے دل کی گہرائیوں سے بے اختیار نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گل نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے اُسے چپ نہیں کرایا۔ اس نے لاچی کو رونے دیا۔ اس کے بازو بیکار تھے۔ اس کا سارا جسم شل تھا۔ وہ نہ سوچ سکتا تھا۔ نہ سمجھ سکتا تھا۔ چپ چاپ لاچی کے قریب ایک بہت کیطرح کھڑا تھا۔

ہولے ہولے لاچی کے آنسو تھم گئے۔

اس نے اپنے آنسو پونچھے، اپنے گیلے رخساروں کو اوڑھنی سے صاف کیا۔ پھر دھیرے سے پلٹ کر سر جھکائے ہوئے (کیونکہ لاچی گل سے آنکھیں نہ ملا سکتی تھی)، اس نے گل سے کہا

"اب میں جاؤں ؟"

"کہاں ۔ ؟"

"جہاں کی میں ہوں ۔ جو میرا فیصلہ ہے، جو میرے رسم و رواج ہیں، جو جب سے دنیا بنی ہے جب سے چلے آر ہے ہیں ۔"

گل نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا ۔

"اب میں کہاں جاؤں ؟ یہ بھی بتاتی جاؤ ؟"

لاچی کے گلے سے ایک چیخ نکلی، لیکن اس نے اُسے حلق ہی میں دبا لیا ۔ دبا دیا، مار دیا، گھونٹ دیا، کتنی ہی اچھی چیزوں کا، اچھے جذبوں کا ۔۔ اچھی آرزوؤں اور تمناؤں کا قتل کرنا پڑتا ہے، جب جانے کا ایک وعدہ پورا ہوتا ہے ۔ وہ چپ کی چپ کھڑی رہ گئی ۔

آسمان تاریک، زمین تاریک، پٹریاں سیاہ، یارڈ بے حس، سگنل کی بتیاں، کانچ کی نقلی آنکھوں کی طرح پلک جھپکائے بغیر ان دونوں کی طرف تک رہی تھیں ۔

"آؤ آخری بار مجھے پیار کر لو ۔"

لاچی نے سسکتے ہوئے کہا ۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں تھے ۔ جب کوئی ان کے قریب آکر کھنکارا ۔ گل نے لاچی کو اپنے بازوؤں سے

الگ کئے بغیر ذرا سا مڑکے دیکھا۔ رامو تھا۔

رامو نے آہستہ سے کہا۔

"اسٹیشن پر تم دونوں کو بلایا ہے۔"

پلیٹ فارم پر تھرڈ کلاس کے خالی یارڈ کے باہر پائخانوں کی اوٹ میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ گل نے دل ہی دل میں سوال کیا۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ نہ کوئی گاڑی آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ڈیوٹی کا اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں ایک کرسی سے دوسری کرسی لگائے سو رہا تھا۔ یہ لوگ یہاں آکر کیا کر رہے ہیں؟

مگر ان لوگوں میں کوئی مسافر نہ تھا، سبھی دن رات ریلوے پر کام کرنے والے لوگ تھے، قلی اور یارڈ مین، مستری اور کانٹے والے گھنٹی بجانیوالے اور پانی پلانیوالے۔

رامو نے کہا۔

"ان لوگوں نے تمہاری کہانی سنی ہے۔ یہ لوگ تمھاری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

پانی پلانیوالے ماتا دین نے اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے دو نوٹ نکالے، ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا، ایک ایک روپے

کے دو نوٹ تھے۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک اٹھنی نکالی ساڑھے سات روپے اس نے لاچی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ادھیڑ عمر کے داؤد نے اپنی کھچڑی سی داڑھی کھجائی۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور پچیس روپے لاچی کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ روپے دیکر وہ کچھ نہیں بولا۔ سر جھکا کر آہستہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

کالا بھجنگ لین مستری اپنے سفید سفید دانت نکالے ہوئے آگے بڑھا۔ اس نے چالیس روپے لاچی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

گھنٹی بجانیوالا ڈیلسوزا آگے بڑھا۔ اس نے دس روپے نو آنے دیئے۔

ایک بڈھا قلی جس کے سر پر کشادہ پگڑی تھی اور جس کی نیلی وردی پر اب تک تین سو نو نمبر کا پیتل کا بِلّا چمک رہا تھا۔ ہولے سے آگے بڑھا اور بولا۔

"ہم قلیوں نے چندہ کر کے ایک سو بینتیس روپے جمع کئے ہیں۔"

وہ سارے روپے اس بڈھے قلی نے لاچی کی اوڑھنی

میں ڈال دیئے۔ دو چار پانچ کر کے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ لاجی کی اوڑھنی دھیلوں اور سکوں سے بھاری ہوتی گئی۔ اور وہ فرطِ احسان سے جھکتی گئی ــــ پھر یکایک سب اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔

کوئی کچھ نہ بولا۔

رامو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہم گریب لوگ ہیں۔ ہمارے جیتے جی تیری کوئی حجت نہ لے گا۔ جا اپنے سردار کو یہ روپیہ واپس کر دے۔"

لاجی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے ــــ یکایک اس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے روشن ہو گئیں۔ اس نے لپک کر رامو کا ہاتھ چوم لیا۔ اور داؤد کا اور بڈھے قلی کا اور وہ خوشی سے ناچنے لگی اور سب کو دعائیں دینے لگی۔

کیسے مسکراتے ہوئے چہرے تھے، کیسی روشن نگاہیں تھیں۔ گل حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی فرشتہ نہیں تھا، سبھی انسان تھے، خطاؤں کے پتلے، خامیوں سے بھرپور لیکن یہ کیسا نور تھا جو اس وقت ان کے بدن کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہا تھا۔ کون کہتا ہے آسمان تاریک ہے؟ کون کہتا ہے زمین بنجر ہے؟ کون کہتا ہے یہ پٹری کہیں نہیں جاتی۔ یہ سگنل

یونہی چمکتے ہیں، ہواؤں میں یہ کیسی خوشبو ہے؟ کانوں میں یہ کیسی راگنی ہے؟ کلیوں مسکراؤ! شگوفو کھِل جاؤ، بہارو آجاؤ، آج انسان نے اپنا قرض چکا دیا ہے۔

بوڑھے قلی نے اپنی بھنوؤں کے نیچے سے ایک آنسو پونچھا۔ آگے بڑھ کر اس نے لاچی کا ہاتھ گل کے ہاتھ میں دیا اور بولا "اسے گھر تک چھوڑ آؤ۔"

گل اور لاچی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اب پٹریاں صاف اور سیدھی تھیں۔ پٹریوں کو پار کر کے جو ٹیلا دکھائی دیا تو جیسے نور کے مینار کی مانند بلند اُنھیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ جنگلے سے پرے خانہ بدوشوں کے گرد جیسے روشنی کے ہالے کھنچے ہوئے تھے۔ خیموں سے پرے درختوں کی قطار پر شگوفے سوئے پڑے تھے۔

گل نے ایک گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا "خدا کرے کل بہار آجائے۔"

گل سے رخصت ہونے کے بعد لاچی پہلے تو سیدھی

اپنے خیمے کو چلی، پھر کچھ سوچ کر تیزی سے پلٹی اور ڈراتی ہوئی دمارو کے خیمے تک آ پہنچی۔ وہاں پہنچ کر دمارو کو زور سے آواز دینے لگی۔

" دمارو — !

دمارو — !!

لیکن دمارو نہ بولا

لاچی نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔

خیمے میں دمارو نہ تھا۔ صرف جاماں سو رہی تھی۔ لاچی نے پیر کی ٹھوکر مار کر جاماں کو جگا دیا۔ جاماں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی اور لاچی کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

" کیا ہے ؟ — اس وقت — تم یہاں — ؟"

" دمارو کہاں ہے ؟ "

لاچی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

" شام سے غائب ہے۔" جاماں آنکھیں ملتے ہوئے بولی

" کیا کام ہے ؟ "

" کہاں گیا ہے ؟ "

لاچی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے پھر پوچھا۔

" پلاسٹک کے کارخانے والے سیٹھ نے بلوایا تھا۔ شام

ہی سے چلا گیا تھا، ابھی تک نہیں آیا۔"

گنگناتے ہوئے لاچی وہاں سے پلٹی، پلٹ کر ٹیلے کے پیچھے چلی گئی۔ جہاں ٹیلے کے تاریک سائے میں گل کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"روپے دے آئیں۔؟"

گل نے بہت بے چینی سے پوچھا۔

لاچی نے اُسے اُبھری ہوئی اوڑھنی دکھا کے کہا۔

"کم بخت ملا ہی نہیں، اب صبح ہی دونگی۔"

"اب تم مجھے کب ملوگی؟"

"صبح قرضہ چکاتے ہی تمہارے پاس آجاؤنگی۔ اسی پرانے پل پر تم میرا انتظار کرنا۔"

"بہت اچھا۔"

گل اطمینان سے رخصت ہوا۔ لاچی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے خیمے میں داخل ہوئی۔ مامن نے ہلکی سی کروٹ لی۔ لیکن پھر مدہوش ہوکر سو گیا۔

لاچی خیمے کے اندر پہنچی۔ اِدھر اُدھر غور سے دیکھ کر اس نے مٹی کے کوزے میں سارے سکے، نقدی اور نوٹ ڈالدیئے

اور خیمے کے اندر زمین کھود کر اس نے مٹی برابر کر دی۔ اور پھر اس کے اوپر اپنی چٹائی بچھا کر اطمینان سے سو گئی۔ بہت عرصے بعد اُسے یوں ایسی گہری نیند آئی۔

صبح اُسے ماں نے کچی نیند سے جگا دیا۔ ورنہ وہ جانے کب تک سوتی رہتی۔

"اُٹھ کم بخت! لکڑیاں چُن کے لا۔ آج کھانا نہیں پکائے گی کیا، سورج سر پر آگیا۔"

لاچی ہڑبڑا کے اُٹھی۔ اور رفع حاجت کیلئے باہر چلی گئی پھر اس نے جلدی جلدی ریلوے کے یارڈ میں پڑے ہوئے گھاس کے گٹھوں سے گھاس کے خوشے کھونسے، اِدھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں کچھ گرے ہوئے اُپلوں کے ٹکڑے جمع کئے۔ اور واپس آکر اپنی ماں اور ماسن کیلئے چائے تیار کی۔ اتنے میں خیموں کے مرکز کی کھلی جگہ میں خانہ بدوش اکٹھے ہوئے اور دف بجانے لگے۔ اور خوشی سے گیت گانے لگے۔

لاچی اپنا کوزہ چھوڑ کر بھاگی۔

آسمان صاف تھا، درختوں کی شاخوں پر لال لال شگوفے

کھلے تھے، جیسے سینکڑوں آفتاب ٹہنیوں پر اُتر آئے ہوں، بہار کا یہ کیسا سرمدی اعجاز ہے؟

لاچی خوشی اور مسرت سے ان شگوفوں کو دیکھنے لگی. آج اس کا بیاہ ہوگا، آج وہ گل کے گھر جائیگی. خوشی سے وہ ناچنے لگی. اور خانہ بدوشوں کے بیچ میں جا کھڑی ہوئی.

یکایک دمارو کا سیاہ اور کمزور ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا. اور وہ ناچتے ناچتے رُک گئی.

"آج جشنِ بہاراں ہے۔"

دمارو خوشی سے بولا

"ہاں آج جشنِ بہاراں ہے۔"

لاچی بہت مسرت سے بولی.

"آج تمہارا بیاہ ہوگا۔"

دمارو پھر خوشی سے چیخ کر بولا۔

"ہاں آج میرا بیاہ ہوگا۔"

لاچی بہت اطمینان سے بولی

"مجھ سے!" دمارو نے کہا۔

"تجھ سے نہیں، اپنے گل سے!"

دمارو چیخ کر بولا۔

"اپنے وعدے سے مکرتی ہے مالزادی۔"

خانہ بدوش لڑکی کبھی اپنے وعدے نہیں مکرتی۔"

"تو نکال میرا روپیہ! لوگو پنچایت کرو۔ پنچایت بیٹھے
ابھی پنچایت بیٹھے، میں اپنا جھگڑا پیش کرتا ہوں۔"

سب لوگ زمین پر بیٹھ گئے

سردار دمارو نے کہا۔

"اس لڑکی کو اس کا باپ ساڑھے تین سو روپے میں
میرے ہاتھ ہار گیا۔ میں نے اسے اپنے خیمے میں لانا چاہا۔ کوئی
بے انصافی کی؟"

"نہیں —!"

سب لوگ سر ہلا کے بولے۔

"یہ نہیں آئی۔ بولی میں تیرے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں نے
اپنا روپیہ اس کے باپ سے مانگا۔ اس نے نہیں دیا۔ اس
کی ماں سے مانگا اس نے نہیں دیا۔ بولو کوئی بے انصافی کی؟"

"نہیں —!"

خانہ بدوش زور سے چیخے۔

"تب اس لڑکی نے مجھ سے کہا. میں بہار کے دن تک تیرا روپیہ لوٹا دونگی، آج بہار کا دن ہے. اس سے آج تک صرف صرف اسی روپے لوٹائے ہیں ۔ ساڑھے تین سو میں سے صرف اسّی! آج میں اس سے کہتا ہوں تو میری ہو جا، لولو، کوئی بے انصافی کی ہے؟"

" ہرگز نہیں ۔ "

پھر سب خانہ بدوش ایک آواز میں زور سے بول اُٹھے.

دمارو چپ ہو گیا اور فتح مند نگاہوں سے لاچی کیطرف دیکھنے لگا.

لاچی نے مضبوط آواز میں کہا.

" میں اس کا روپیہ لے آتی ہوں. رات کو یہ اپنے خیمے میں نہیں تھا. اپنی ہونے والی بیوی کا پلاسٹک کی مل کے مالک سے سودا کرنے گیا تھا۔ "

" یہ جھوٹ ہے ۔ ! "

" یہ جھوٹ ہے ۔ !! "

دمارو زور سے چیخا.

لاچی زور سے بولی.

"چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں. میں ابھی سب پنچوں

کے سامنے تیرا روپیہ لوٹائے دیتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر لاچی تیزی سے مڑی اور اپنے خیمے کے اندر چلی گئی۔ اندر جس چٹائی پر وہ سوئی تھی وہ اسی طرح بچھی تھی۔ لاچی نے جلدی سے چٹائی کو وہاں سے ہٹا کر پھینک دیا۔ اور پھر زمین کھودنے لگی۔ بھربھری مٹی اوپر آتی گئی۔ تھوڑی دیر میں گڑھا نمودار ہو گیا لیکن اس گڑھے میں کچھ نہ تھا۔ جہاں اس نے مٹی کا کوزہ رکھا تھا وہاں اب کچھ نہ تھا، نہ کوزہ، نہ نوٹ، وہاں کچھ نہ تھا۔

لاچی لپک کر باہر آئی۔

باہر آتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔

"کس نے میرا روپیہ لیا ہے؟"

سب لوگ چپ تھے۔

خانہ بدوشوں کا گروہ حیرت سے لاچی کو دیکھ رہا تھا۔

لاچی نے پلٹ کر اپنی ماں کا گریبان پکڑ لیا۔

"بول ماں! میرا روپیہ کہاں ہے؟"

ماں نے بڑی مضبوطی سے جواب دیا۔

"میں نے نہیں لیا۔"

ماں کی نگاہوں میں سچ تھا۔ لاچی وہاں سے پلٹ گئی۔

اس نے اپنے چچا مامن کو پکڑا، چیخ کر بولی.

" میرا روپیہ واپس دیدے بدمعاش ۔ "

مامن زور سے ہنسنے لگا ۔ بولا

" یہ جھوٹی ہے ۔ اب بہانے کرتی ہے ۔ "

" جھوٹی ۔۔! مکار ۔۔!! فریبی ۔۔!!! " سارے خانہ بدوش چیخ پڑے ۔ " آج اِسے دماروکی دلہن بننا پڑے گا ۔ "

" آؤ آؤ جاماں ، روشی ، سنیاں آؤ اِسے دلہن بناؤ ۔ "

سارے خانہ بدوش لاچی کے گرد خوشی سے ناچنے لگے ۔

گل پرانے پل پر کھڑا تھا۔

اور حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ خانہ بدوش اپنے خیموں کے باہر ناچ رہے ہیں ، گا رہے ہیں اور زور زور سے دف بجا رہے ہیں اور لاچی ان کے بیچ میں دلہن بنی کھڑی ہے اور عورتیں بار بار اس سے کچھ کہہ رہی ہیں ۔

گل تیزی سے پل سے اُتر کر خیموں میں چلا گیا۔

سیدھا جاکے لاچی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

اس وقت لاچی کی ماں چاندی کی ہتی والا خنجر خیمے سے نکال لائی تھی اور اُسے لاچی کیطرف بڑھا کے کہہ رہی تھی ۔

" اب تو ختم ہو گیا، سب جھگڑا ختم ہو گیا۔ تو ہار گئی ہے۔ اب تجھے دلہن کا ناچ ناچنا پڑے گا۔ "

یکایک گل لاچی کے سامنے چلا گیا۔

اُسے دیکھ کر سازے خانہ بدوش ذرا ذرا سا پیچھے ہٹ گئے۔ اور ٹیڑھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگے مگر سب خاموش تھے۔ نہ دف بجتی تھی۔ نہ کوئی راگ سنائی دیتا تھا۔ جیسے زمین نے سانس روک لی ہو۔

" لاچی۔! "

لاچی نے گل کو ایک نظر سے دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

" لاچی چل میرے ساتھ، میں تجھے لینے آیا ہوں۔ "

گل نے بڑی بے خوف آواز میں کہا۔

لاچی وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔

گل نے حیرت سے پوچھا۔

" لاچی! تو نے دلہن کا لباس پہنا ہے؟ "

" ہاں ۔ "

" تجھے کل کا وعدہ یاد نہیں ہے۔ "

" یاد ہے۔ میں نے کہا تھا، کل میں دلہن بنوں گی۔ "

"مگر تُو تو میرے ساتھ چل کے دلہن بننے والی تھی؟"

لاچی جھک سی گئی۔ جیسے اس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ "

وہ آہستہ سے بولی۔

"گل وہ روپے چوری ہو گئے۔ میں اپنا قرضہ نہیں چکا سکی۔"

"چوری ہو گئے؟" گل نے بے اختیار چیخ کر پوچھا

"چوری ہو گئے؟ نہیں، نہیں تُو جھوٹی ہے تُو مجھ سے مذاق کرتی ہے۔"

لاچی سر جھکائے گل کے سامنے کھڑی رہی۔

گل کو بے حد غصہ آیا۔ اس کا سارا جسم سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

"میں جانتا ہوں تُو جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے وہ روپے دمارو کو دیدیئے ہیں اور اب تو اُس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ میرا باپ سچ کہتا تھا۔ یہ خانہ بدوش لڑکیاں ہمیشہ بے وفا ہوتی ہیں۔ ان کا اعتبار نہ کر، میرا بوڑھا باپ سچ کہتا تھا۔ یہ آوارہ اور مکار ہوتی ہیں۔ یہ شریف آدمیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر اُنھیں تباہ کر ڈالتی ہیں۔"

لاچی نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں سے صرف ایک بار گل کیطرف دیکھا پھر آہستہ سے سر جھکا لیا۔

گل اس کے زور سے تھپڑ مارنے کو تھا۔ پھر اُس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو روک لیا۔ دیر تک وہ لاچی کو دیکھتا

رہا۔ اور پھر وہ آہستہ سے گھوما۔ آہستہ سے چلا۔ آہستہ سے چلتا گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ٹیلے کی اوٹ میں جا رہا تھا۔

لاچی نے آہستہ سے کہا۔

"وہ خنجر مجھے دیدو ماں۔ میں اب دلہن کا ناچ ناچونگی۔"

دف بجنے لگے۔

گھنگھرو کھنکنے لگے۔

جسم مچلنے لگے۔

چہرے چمکنے لگے۔

گیتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ پاؤں تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ ہاتھ ٹانگوں کی طرح جنبش میں آتے گئے۔ لے تیز ہوتی گئی۔ ناچ کی دھمک ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ خانہ بدوش ناچتے ناچتے خوشی سے وحشیانہ طور پر چیخنے لگے۔

رقص کے ہر موڑ پر لاچی دمارو کے قریب آتی۔ اور رسم کے مطابق اپنے خنجر کو جھکا کر دمارو کے پاؤں سے چھو کر واپس چلی جاتی۔ ایسی پھرتی سے، اس تیزی سے، اس انہماک سے، اس فنکاری سے وہ آج تک کبھی نہ ناچی تھی۔

ناچتے ناچتے وہ جیسے اپنے وطن کو، اپنے قبیلے کو، اپنی روایت

کو لوٹ آئی تھی۔ وہ بھول گئی تھی۔ کہ اس نے کبھی کچھ اور بھی سوچا تھا۔ وہ بھول گئی۔ اس نے کبھی کوئی اور سپنا بھی دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سرکش نگاہ تھی۔ جو ہر خانہ بدوش لڑکی کی آنکھوں میں ہوتی ہے اس کا ناچ اسیطرح طوفانی اور وحشی تھا۔ سمندر کی لہروں کیطرح تھپیڑے مارتا ہوا کسی زہریلی ناگن کیطرح پیچ و تاب کھاتا ہوا، ہر تہذیب سے بغاوت کرتا ہوا، ہر ٹھہراؤ سے ٹکر لیتا ہوا۔ وہ بے سدھ اپنے رقص میں خوش، اپنے آپ میں غلطاں ناچ رہی تھی۔ اور خانہ بدوش زمین کی سنہری گرد اڑاتے ہوئے اپنے قبیلے کی بیٹی کے گرد رقصاں تھے اور دور اوپر درختوں کے سبز پتوں کے جھومر میں سرخ شگوفے ہنس رہے تھے۔

یکایک ناچ کا آخری چکر لیتے ہوئے لاچی دمارو کے سامنے آئی اور رسم کے مطابق اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کئے تاکہ دمارو اُسے اپنی آغوش میں لے لے۔

دمارو نے آگے بڑھ کر ناچتی ہوئی، لچکتی ہوئی لاچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اسی لمحے لاچی نے اپنا خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا۔

گل گلی میں کھڑا تھا۔

سامنے دروازے پر داؤد کی بیوی کھڑی تھی۔

گل چقماق کی چرخی پر ایک چھری تیز کر رہا تھا اور بار بار گھومتی ہوئی چرخی کو اپنے پاؤں کی ضرب سے تیز کرتا جا رہا تھا۔ چھری کی دھار چقماق سے ٹکراتے ہوئے ایک تیز خراش دار آواز پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی چقماق اور لوہے کی ٹکر سے ایک شعلہ سا بلند ہوتا اور پھر بجھ جاتا۔ چرخی پھر چلنے لگتی۔

داؤد کی بیوی نے گل سے پوچھا۔

"لاچی کو سزا ہو گئی؟"

گل چرخی پر جھک گیا۔ جیسے غور سے وہ چرخی میں کسی خامی کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں اُسے عدالت نے تین سال کی سزا دی ہے۔"

داؤد کی بیوی نے اُسے ہمدردی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

گل نے اسی طرح چرخی کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس کا انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر چرخی چلانے میں اور چھری تیز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک اس نے چھری کی دھار پلٹی اور دوسری

طرف سے تیز کرنے لگا۔

"ارے، ارے یہ کیا کرتے ہو؟"

داوُد کی بیوی حیرت سے بولی۔

"پہلے تو تم چھری کو صرف ایک طرف سے تیز کرتے تھے۔"

گل نے آہستہ سے کہا۔

"اماں! یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ یہاں چھری کی دھار کو اب دونوں طرف سے تیز کرنا پڑے گا۔"

حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں دوست تھے۔ دونوں نے مل کر شیئر میں ایک بینک کھولا تھا۔ دونوں نے مل کر اس بینک کے ذریعے لوگوں کو خوب لوٹا تھا۔ دونوں پکڑے گئے۔ اور اب جیل میں سزا بھگت رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اس ہوشیاری سے کام لیا تھا کہ روپیہ پولیس ان سے نہ اگلوا سکی تھی۔

سترہ لاکھ کا غبن تھا۔ اتنا روپیہ کوئی آسانی سے کیسے دے سکتا ہے؟ چاہے برسوں کی جیل کیوں نہ ہو جائے۔ اس لئے دونوں بڑے مزے سے جیل میں رہتے تھے اور روپے کے زور سے جو چاہتے کرتے۔

اسسٹنٹ جیلر ان کا دوست بن گیا تھا۔ وارڈر ان کی مٹھی میں تھے۔ اس لئے دونوں دوست جیل میں بھی اسی شان سے رہتے تھے۔ جیسے وہ جیل میں نہ ہوں، مائیکل روڈ کے کسی اچھے فلیٹ میں رہتے ہوں۔ ان کا کھانا عمدہ سے عمدہ ہوٹلوں سے آتا تھا۔ اسٹیٹ ایکسپریس سے کم کا سگریٹ وہ نہ پیتے تھے۔

ریس جانے کو جی چاہتا تو سپرنٹنڈنٹ جیل کی نظر بچا کر ریس بھی چلے جاتے تھے۔ کئی بار وہ دلدار روڈ پر جاکر طوائفوں کا گانا بھی سن آئے تھے۔ ان موقعوں پر احتیاطاً دو ہٹے کٹے وارڈر بھی ان کیساتھ رہتے۔ ان کا روپیہ اب محفوظ جگہ پر تھا۔ اس لئے جیل سے نکل بھاگنے کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا۔ ہوسکتا ہے یہی سوچ کر اسسٹنٹ جیلر بھی انھیں ڈھیل دیتا ہو۔

اسسٹنٹ جیلر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں ایک کالج میں معاشیات کا لیکچرار تھا۔ تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی کنبہ بڑا تھا۔ اس لئے ہمیشہ تنگ دست اور چڑچڑا رہتا تھا۔ کلاس میں لڑکوں سے ایسا سلوک کرتا جیسے وہ تھانیدار ہو۔ پروفیسر نہ ہو۔ لڑکے اس سے ہمیشہ نالاں رہتے۔ دو تین بار کالج میں اس کے خلاف اسٹرائیک بھی ہوئی۔

انگریزوں کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج کا وہ لیکچرار تھا۔ انگریز پرنسپل تھا۔ انگریزوں کو اس زمانے میں اسٹرائیک کے پیچھے انقلابیوں کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ اسی کا فائدہ اٹھا کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن نے اپنے پرنسپل کی سفارش سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ اور کالج کی لیکچرار شپ کو خیرباد کہہ کر جیل کے محکمے میں آگیا۔

کیونکہ صوبے کی جیلوں کا انچارج انگریز اس کے پرنسپل کا دوست تھا۔ یہ محکمہ کالی چرن کو بہت پسند آیا۔ بالکل اس کی طبیعت اور مزاج کے مطابق تھا۔ پھر یہاں انڈا، سبزی، گوشت، دودھ، ملازم سب مفت ملتے تھے۔ امیر قیدیوں کو مراعات دے کر وہ ان سے ہر ماہ خاصی رقم اینٹھ لیتا تھا۔

کالج کے لڑکوں سے چند ذلیل قسم کے ٹیوشنوں کے سوا اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ یہاں وہ بے حد خوش تھا۔ جیسے اپنوں میں آگیا ہو۔ یہ درست ہے کئی بار وہ معطل ہوا، کبھی اس کی ترقی ہوئی کبھی تنزل کیا گیا۔ مگر یہ تو زمانے کے اُتار چڑھاؤ ہیں۔ اونچی لہروں پر سوار ہو کر آدمی کبھی آگے نکل جاتا ہے کبھی وہی لہریں اُسے دھکیل کر پیچھے پھینک دیتی ہیں۔

زمانہ ایک سمندر ہے۔ اس میں ہمیں رہنا ہے۔ اسی میں ڈوبنا

ہے۔ اس کا غم کیا؟

کالی چرن صرف اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے اپنے آپ کو بے حد مستعد اور دیانت دار ثابت کرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بھی ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اگر وہ جیلر نہ ہوتا تو ادیب ہوتا، شاعر ہوتا، موسیقار ہوتا، لیڈر ہوتا۔ یعنی وہ ایسا کچھ ضرور ہوتا جہاں اُسے اپنی بات کہنے اور سننے اور منوانے کے ذرائع میسّر آتے۔

اس کا دل ایک عجیب وغریب نرمی اور مہربانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انسان کیلئے کچھ کرنا چاہتا تھا، اس کے ذہن میں عجیب وغریب تصورات کے ہیولے تھے۔ وہ خدمت کرنا چاہتا تھا اور نیک بننا چاہتا تھا۔ اور انسان کے دکھ درد کا مداوا ڈھونڈنا چاہتا تھا۔

بچپن ہی سے اُسے مصوری کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کے والد رائے بہادر شری گنگا سہائے ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات تھے۔ اور یہ محکمہ ایک طرح سے ان کا اپنا ہی تھا اور زمانہ انگریزوں کا تھا۔ اور رائے بہادر کا شمار سرکار انگلشیہ کے فرزندانِ خاص میں ہوتا تھا۔ اس لئے انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے بیٹے خوب چند کو جیل میں بھرتی کرلیا جائے۔ گو خوب چند کا ارادہ پیرس میں مصوری سیکھنے کا تھا۔ لیکن رائے بہادر کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اور وہ جیل کے محکمے میں

بھرتی ہوگیا۔

اگر وہ ضدی اور خودسر ہوتا تو بھوکا رہ کر مصوری کو جاری رکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ۔ بیحد شریف آدمی تھا۔ اس لئے وان گوگ تو نہ بن سکا۔ جیلر بن گیا۔ لیکن اسکی طبیعت کی نیکی اور دل کی شاعری اور تصورات کی مصوری یہاں بھی اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ قیدیوں سے بہت نرمی اور ملائمت سے پیش آتا تھا۔ اپنے عملے کو اس نے بہت ڈھیل دے رکھی تھی۔

انسانوں پر بھروسہ کرنا اس کے مزاج کا حصّہ بن چکا تھا مصوری کا شغل اب بھی جاری تھا لیکن وہ جدید مصوّری سے بہت بیزار تھا۔ جس میں عورتیں سرکنڈوں کیطرح بدصورت اور دُبلی پتلی ہوتی جاتی ہیں اور مرد مجسّمّس کیطرح موٹے۔ اُسے لوک مصوری بھی پسند نہ تھی۔ جس میں دیہاتیوں کا سا بچکانہ پن پایا جاتا ہے۔ اُسے پرانے بنگال اسکول کی مصوری بہت پسند تھی۔

دھیمی دھیمی، سست اور سوئی ہوئی مصوّری! اونگھتا ہوا سا ماحول، فطرت غنودگی کے نشے میں سرشار۔ بانس کے جھنڈوں میں نیم مستور گاؤں اور ندی کے کنارے خیالات میں کھوئی ہوئی حسینہ ایسی پیاری، ایسی نازک، ایسی کٹیلی آنکھوں والی کہ اگر پلٹ کر کہیں ایک نگاہ بھی ڈال دے تو آدمی وہیں خاک ہوجائے، جانے کس دیس ہیں

یہ عورتیں رہتی ہیں ؟ کیا کھاتی ہیں ؟ کھاتی بھی ہیں کہ صرف اپنے حسن کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں ؟ اور واقعی ایسی مکمل عورت کو کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے ؟ ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی کیا ضرورت ہے ؟ وہ تو ایک تصویر ہے جسے آدمی سونے کے فریم میں جڑاؤ کر دیکھا کرے۔

اور بہت سے آدمی ایسا سوچتے ہیں اس لئے بہت سی عورتیں ایسے ہی سونے کے ایک فریم کی خواہش کیا کرتی ہیں۔ خوبچند کے پاس سونے کا فریم تو تھا، لیکن وہ مکمل عورت اُسے آج تک نہ مِل سکی تھی۔

اس لئے عمرِ عزیز کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی وہ کنوارا تھا۔ اس لئے اس کے دل میں اُمید کی وہ لَو بھی کم ہو گئی تھی۔ شاید اُسے وہ مکمل عورت کبھی نہ مل سکے گی۔ اور جوں جوں اس کے دل میں یہ نااُمیدی گھر کرتی جاتی۔ وہ اپنی تصویروں کی عورت کے نقوش نازک سے نازک تر سانچوں میں ڈھالتا جاتا۔ کبھی کبھی وہ اُن تصویروں کو دیکھ کر رو دیتا۔

کیا ان میں سے کوئی تصویر زندہ نہیں ہو سکتی ؟ کیا یہ ہونٹ بول نہیں سکتے ؟ کیا ان باہوں کا مرمر میری باہوں میں نہیں آ سکتا؟ یہ صف آرا پلکیں اگر میرے رخساروں پر گر جائیں تو کیا ہو ؟ تو کیا ہو بھی

کوئی منچلا اُسے یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ اس معجزے کے بعد محبت ہو گی۔ محبت کے بعد ممکن ہے شادی ہو۔ شادی کے بعد ممکن ہے بچے ہوں۔ بچوں کے بعد ممکن ہے جھگڑے ہوں۔ بچوں اور جھگڑوں کے بعد طویل سالہا سال ساتھ رہنے کے بعد ممکن ہے وہ عورت سرکنڈے کیطرح دبلی تپلی یا مجسم کیطرح موٹی ہو جائے۔ اور اس کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پارہ پارہ ہو جائے۔

شاید اسی لئے اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ وہ صرف پانی پر تیرتے ہوئے کنول دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ کہ اس کیچڑ کو جہاں سے کنول پیدا ہوتا ہے نہ کہ اس انجام کو جہاں پر کنول کی پتی پتی مرجھا جاتی ہے۔

خوب چند ایک خاص رومانیت پسند انسان تھا۔ اور اپنے تصورات کے جیل خانے میں بند رہتا تھا۔ اس کیطرح بہت سے انسان ہمیشہ کسی نہ کسی جیل خانے میں بند رہتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔

جب پہلی بار لاچی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں لائی گئی۔ تو خوب چند اُسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے اب تک جو تصویر اس کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی تھی۔

آج زندہ ہو کر اس کے سامنے جلوہ گر ہے۔ وہی فسردہ، سوگوار سا حسن، آنکھوں میں وہی کٹیلا پن، چال کا وہی انداز، گرد و پیش سے بے پروا۔ اور ــ بے نیاز لاچی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

چند لمحوں تک وہ اُسے مبہوت اور پریشان دیکھتا رہا۔ اس کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کمرے میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کا اسٹینوگرافر تھا۔ دو اور کلرک تھے وارڈر تھے، اچھا خاصا عملہ تھا۔ خوب چند نے لاچی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر لاچی کے کاغذات پر ڈالیں۔ یہاں پر اُسے ایک اور دھچکا لگا۔

"تم نے قتل کیا ہے ؟"

خوب چند نے بے اختیار ہو کر حیرت سے لاچی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ورنہ یہاں کیوں آتی جی ؟"

لاچی نے پوچھا۔

"سیدھے سیدھے بات کرو۔" ایک وارڈر بولا۔ "یہ سپرنٹنڈنٹ جیل ہیں۔"

"اچھا۔"

لاچی نے ہاتھ کے اشارے سے انتہائی بے پروائی سے خوب چند کو سلام کیا جیسے وہ اپنے ماتھے سے کوئی مکھی ہٹا رہی ہو۔"

"نہیں نہیں بات کرنے دو۔"

خوب چند یکایک نرمی سے بولا۔ اور اس کی نگاہیں کاغذات پر جھک گئیں۔ وہ دیر تک کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ چند لمحوں تک وہ لاچی کے چہرے کیطرف نہ دیکھ سکا۔ جس کے چہرے پر اب استہزا کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔

"یہ تصویر بولتی بھی ہے، یکایک خوبچند نے سوچا، متحرک بھی ہے۔ لیکن سینما کیطرح نہیں زندگی کیطرح، پھر بھی اُسے شدید دھچکا لگا۔ کیوں لگا؟ کیا اس لئے کہ جسطرح وہ جس تصویر کو بولتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح سے یہ تصویر نہیں بول رہی تھی۔ اسکی تصویر تو شاید اس سے ٹیگور کے نغموں میں خطاب کرتی۔ عمر خیام کی رباعیاں سناتی یا کیٹس کی لبمیا کیطرح کسی انجانے جزیرے کو مدھم مدھم سروں کے میٹھے سنگیت سے لبریز کر دیتی۔

لیکن یہ کیسا کھرّا سپاٹ لہجہ تھا اس تصویر کا! خوبچند کو شدید ذہنی کوفت ہوئی۔ اس نے ذرا کڑوے لہجے میں پوچھا۔

"کوئی کام جانتی ہو؟"

"باسکٹ بن سکتی ہوں اور چٹائیاں ..... اور ..." وہ رک گئی۔

"اور ـــــ ؟"

خوب چند نے پوچھا۔

"اور نٹوں کے سب کرتب جانتی ہوں۔ ایک تنے موٹے رسے پر چل سکتی ہوں۔ جلتے ہوئے گولے میں سے گزر سکتی ہوں ایک سانس میں دس قلابازیاں لگا سکتی ہوں۔"

کدھر گئی وہ تصویر، وہ بانسوں کے سرسراتے ہوئے جھنڈ ہوا رُومان کی خوشبو سے مہکی ہوئی اور ندی کے کنارے گردن جھکائے اداس محزون حسینہ، کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ ارے یہ تو بالکل وہی تصویر ہے لیکن کتنی مختلف، خوب چند اندر ہی اندر بلبلا اٹھا پچاس برس سے وہ جس تصویر کو دیکھتا آیا تھا۔ آج وہ ایک لمحے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے قدموں میں پڑی تھی۔

لاچی کی آواز آ رہی تھی۔

"اور پنجہ بھی لڑا سکتی ہوں۔" لاچی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ "لڑاؤ گے ؟"

کمرے میں جتنے لوگ تھے سب ہنس پڑے۔ مگر دلدار خاں

پنجابی وارڈر کو بے حد غصہ آیا۔ اور یونہی سپرنٹنڈنٹ جیل کی عزت رکھنے کیلئے یہ موقع اچھا تھا۔ اس نے فوراً کہا ۔۔ "صاحب کی بات جانے دو پہلے ہم سے پنجہ لڑاؤ !"

دلدار خاں پنجابی نے اپنا موٹا کھردرا ہاتھ لاچی کیطرف بڑھایا۔ لاچی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ بولی۔

"تمہارا ہاتھ مجھ سے تگڑا معلوم ہوتا ہے۔"

کمرے میں سب لوگ ہنسنے لگے۔

دلدار خاں نے جھک کر طنزاً کہا۔

"بس ڈر گئیں ۔؟"

لاچی کا منہ لال ہوگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دلدار خاں کی ہتھیلی پر جھپٹا مارا اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنسا دیں۔ دلدار خاں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر زور لگایا۔

لاچی سر سے پاؤں تک لچک گئی۔ لیکن اس کا بازو خمیدہ نہ ہوا

"حرامزادی! نٹنی!!"

دلدار خاں جھلا کر بولا اور اس نے پھر پورا زور لگایا۔

"حرامزادہ تُو، تیرا باپ! پنجہ لڑا، باتیں نہ کر۔"

لاچی غصے میں بھر کر بولی۔

دلدار خاں کا پورا زور لاچی کے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔ لیکن لاچی نے نٹنی کے گر یونہی نہیں سیکھے تھے۔ اس نے اپنے بدن کو جھلا کر اس زور کو سارے بدن پر تقسیم کر لیا۔ مگر اس کی بانہہ اسی طرح دلدار خاں کی بانہہ سے خمیدہ ہو کے الجھی رہی۔

دلدار خاں کا چہرہ جو پہلے سانولے رنگ کا تھا، اب غصّہ سے سیاہ ہوتا جا رہا تھا، یکایک لاچی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنے لگی۔ اور بولی۔

"دیکھ اب میں اپنا پنجہ چھڑاتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ جانے کس طرح لچکی اور ایک حرکت اس نے کی کہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے لاچی کا پنجہ دلدار کے پنجے سے آزاد تھا۔

کمرے میں سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

دلدار خاں پنجابی کا ہاتھ لاچی کو مارنے کیلئے ادھر اُٹھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے زرد، درشت چہرے کو دیکھ کر وہیں رہ گیا۔

"دلدار یہ کیا حماقت ہے؟" خوب چند نے ذرا درشتی سے کہا۔ پھر عورتوں کی انچارج جیناں بائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"جیناں بائی اِسے لے جاؤ۔ اور چھ ماہ تک اسے دوسری عورتوں

سے الگ رکھو۔"

"بہت خطرناک عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"میں الگ نہیں رہونگی۔"

"میں الگ نہیں رہونگی۔"

یکایک لاچی زور سے چیخی۔

جیناں بائی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

خوب چند کے حکم سے دو تین وارڈروں نے مل کر لاچی کو گھیرا اور اُسے عورتوں کے سرکل جیل میں پہنچا آئے جو بڑی جیل کے جنوبی کونے میں تھی۔

رات بھر خوب چند کو نیند نہیں آئی۔

وہ بہت دیر تک اپنے خوبصورت فلیٹ کی مدھم مدھم روشنیوں میں دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی ان تصویروں سے کیسی محبت تھی۔ جیل کی سخت گیر بوریت اور ظلم و ستم سے بھری ہوئی دنیا کے بعد یہ تصویریں ہی اس کا سہارا تھیں۔ یہی تصویر اس کی بیوی تھی۔ اس کے بچے، اس کے دوست، برسوں کی تپی ہوئی ریاضت اور الفت اس نے اِن تصویروں کی ایک ایک لکیر میں گھلادی تھی۔ لیکن یہ برسوں کی جانی پہچانی تصویریں آج اُسے کتنی انجان اور بیگانہ نظر آرہی تھیں۔ جیسے سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ سب کچھ گر گیا تھا۔ سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

وہ تو ان تصویروں کو جانتا بھی نہ تھا۔

یہ تصویریں وہ کیسے بنا سکتا تھا۔ یہ تصویریں بالکل مصنوعی تھیں۔ یہ تصویریں تو اس کی نہ تھیں۔ یہ کسی احمق نومشق کے بے معنی پیچ و خم تھے ان میں کیا رکھا ہے ؟ برسوں سے وہ ان تصویروں کو بلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ تصویریں کیسے بولتیں ؟ مردہ تصوّر کی مردہ لاشیں! ان میں روح ہی نہ تھی پھر یہ تصویریں کیسے بولتیں ؟ اسے لاچی پر بہت غصہ آیا۔ یکایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیکار کاموں میں الجھ کر بوڑھا ہو گیا ہے جیسے وہ کسی غلط راستے پر چلتے چلتے ایک اندھے کنویں پر جا پہنچا ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے دیواروں سے سب تصویریں اتاریں۔ انھیں فریم سے الگ کیا۔ اور آہستہ آہستہ اُنھیں اس طرح پھاڑنے لگا۔ جیسے وہ اپنی زندگی کے پرانے ورق چاک کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کیونکہ زندگی کے ورق کاغذ کے ورق تو ہوتے نہیں۔ وہ پھر نہیں لکھے جا سکتے۔

"ٹھیک ہے، اب وہ صرف جیلر بنے گا۔" اس نے دل میں کہا۔

جیناں بائی جب جوان تھی تو اپنے جسم کا دھندا کرتی تھی۔ اور جب

شباب ڈھلنے لگا تو اس نے جیب کاٹنے کی سائڈ لائن بھی اختیار کر لی. ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مشہور کٹنی بن چکی تھی. اور اس کا کام خوبصورت عورتوں اور لڑکیوں کو پھانسنا اور انھیں مشہور دلالوں کے ہاتھوں فروخت کر دینا تھا۔ اس میں اُسے خاصے پیسے مل جاتے تھے.

خطرہ بھی کافی تھا، چار چھ بار اُسے جیل بھی ہوئی تھی۔ آخری بار جب اس نے حاملہ لڑکی کو پھانسا تو اس کے بچے کا گلا گھونٹ دینے کے جرم میں جنیاں بائی کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ وہ بڑی رحمدل آنکھوں والی، پوپلے منہ والی، میٹھے بول والی بوڑھی عورت تھی۔ اس کی چال ڈھال سے ہر وقت ایک عجیب سی مامتا برستی رہتی تھی. جس سے وہ عورتوں کی جیل میں بہت پاپولر ہو گئی تھی.

چار چھ بار جیل کاٹ کے اب وہ اس ماحول سے مانوس ہو گئی تھی. اب تو وہی جیل اس کا گھر تھی۔ وہی اس کا دیس تھی، وہی اُسکی سیاست، وہ جیل کی عورتوں میں ممتاز تھی تو جیل کے حکام بھی اُسے پسند کرتے تھے. مردوں کی جیل کے مشہور غنڈے بھی اس کی عزت کرتے تھے.

اس لئے کہ وہ سب کام جانتی تھی اور انتہائی رازداری اور دیانتداری اور پوری پوری سچائی سے بے ایمانی کے سارے کام پورے

کرتی تھی۔ جیسے ہر بزنس مین کو ہونا چاہیئے. افسوس حالات نے یاوری نہیں کی. اُسے تعلیم نہیں ملی۔ اور وہ ایک غریب ہندوستانی عورت تھی۔ ورنہ ایک کامیاب بزنس مین کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ اگر اُسے عمر قید نہ ہوتی تو شاید ایک دن وہ لکھ پتی ہو جاتی۔

جیناں بائی باہر کی دنیا کے پیغام عورتوں کی جیل میں پہنچاتی تھی. مردوں کی جیل اور عورتوں کی جیل میں رابطہ بھی اسی کے ذریعے ہوتا تھا۔ چرس اور افیم کی درآمد بھی اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ جیل میں دو تین عورتیں ایسی تھیں کہ کسی طرح مارفیا کے انجکشن کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھیں۔ یہ کام بھی جیناں بائی کے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ آہنی سلاخوں کے ادہر ادہر کیا عشق نہیں ہو سکتا؟

اس جیل کے لوگ کیا عورتوں کو بھول جاتے ہیں؟ کیا وہ مرد نہیں ہوتے؟ کیا ان کے جذبات نہیں ہوتے؟ کیا ان جذبات کو آگ نہیں لگ سکتی؟ کیا وہ خشک ماچس کیطرح بھڑک نہیں سکتے؟ زندگی ایک غبارہ ہے جسے اگر ایک طرف سے دباؤ تو دوسری طرف سے اُبھرتا ہے. بہت زیادہ دباؤ تو پھٹ جاتا ہے اور یہ بھی ایک طرح سے بوجھ کے خلاف احتجاج ہی ہے. جسے سمجھنے کیلئے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں ہے. لیکن جیناں کبھی اپنے قیدیوں پر غیر معمولی اور اتنا دباؤ

نہیں ڈالتی تھی۔ بس اتنا ہی جتنا وہ برداشت کر لیں۔ کیونکہ جو سمجھدار مجرم ہوتے ہیں وہ اپنے پیشے میں بھی شریف پیشہ انسانوں کیطرح دباؤ ڈالتے ہیں بس اتنا بلیک میل کرو جتنا دوسرا برداشت کر سکے۔ بس اتنی رشوت لو جتنی دوسرا دے سکے۔ بس اتنی بے عزتی کرو جتنی دوسرا گوارا کر سکے بس اتنی دھمکی دو جس سے اپنا کام نکل سکے۔ بس اتنی چوری کرو جس سے دوسرا زندہ رہ سکے۔ تاکہ اس کے گھر میں پھر چوری کی جا سکے۔

جرم اور سیاست میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

پہلے چھ ماہ بہت آرام سے کٹے۔ گل بھی برابر ملنے آتا تھا۔ کھانا بھی بھیک مانگے بغیر، چوری کئے بغیر، کسی سے بے عزت ہوئے بغیر ملتا تھا۔ مشقت بھی معمولی تھی۔ دوسری عورتوں کیلئے تکلیف دہ ہوگی، لیکن لاچی کیلئے معمولی تھی۔

چھ ماہ کیلئے جو لاچی دوسرے قیدیوں سے الگ رہی تو اس کے دل میں ایک سکون، ایک طمانیت سی پیدا ہو گئی۔ باہر کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد جیل کی یہ زندگی لاچی کو بیحد پرسکون اور خوبصورت معلوم ہوئی۔

ایک روز جیناں بائی لاچی کے پاس گئی اور اس سے بولی۔

" چل تجھے سپرنٹنڈنٹ جیل بلاتا ہے ۔ "

" کیوں بلاتا ہے ؟ "

" مجھے کیا معلوم ؟ " جیناں نے مسکرا کر کہا۔ " تیرے فائدے کا کوئی کام ہوگا، چل ۔۔۔ ! "

لاچی جیناں بائی کے ساتھ ہولی۔ خوب چند نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس وقت سات بج چکے تھے۔ آفس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

خوب چند نے آفس سے ملحق ایک کوٹھڑی خالی کروالی تھی۔ اور اسے اپنے لئے دن میں آرام کرنے اور کھانا کھانے کا کمرہ بنالیا تھا۔ یہیں پر مصوّری کا سامان بھی وہ گھر سے اُٹھا لایا تھا۔ جب لاچی اس کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے لکڑی کے ایزل پر ایک کورے سفید کاغذ کو ٹنگے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

" یہ کیا ہے ؟ "

" تمہاری تصویر بناؤں گا ۔ "

خوب چند نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

" میری تصویر ۔ ؟ " لاچی حیرت اور خوشی کے ملے جُلے جذبات

د تاثرات کا اظہار کرنے لگی۔

خوبچند نے سرہلا کے ایک کونے میں پڑی ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

" وہ تمہاری چیزیں، قمیص، واسکٹ، گھاگرا پڑے ہیں۔ یہ جیل کے کپڑے اتار کے انھیں پہن لو اور جب پہن لو تو مجھے آواز دے دینا۔ میں آفس میں بیٹھتا ہوں۔"

" بہت اچھا ۔"

لاچی لپک کر گٹھری کی طرف بڑھی۔

خوب چند اور جیناں باہر آ گئے۔

باہر آفس میں آکر خوب چند نے جیناں سے کہا۔

" اب تم جاؤ۔"

جیناں نے ایک پُر فریب مسکراہٹ سے خوب چند کی طرف دیکھا۔ اور پھر جھک کر سلام کیا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد لاچی کی آواز آئی۔

" اندر آ جاؤ۔"

خوب چند اندر آ گیا۔

لاچی لکڑی کے ایک چھوٹے سے اسٹول پر دف لئے ایک

عجیب بانکی اداسے کھڑی تھی. خوب چند کو دیکھتے ہی بولی.

" بس ایسی تصویر کھینچ دو۔ "

" ایسی ہی کھینچوں گا. "

خوب چند نے قلم سنبھالا اور رنگوں کی آمیزش شروع کردی.

" مگر کسی سے کہنا مت میں تمہاری تصویر بنا رہا ہوں ۔ "

" اچھا نہیں کہونگی مگر اس میں کیا بُری بات ہے؟ سبھی لوگ فوٹو لیتے ہیں۔ ایک بار ایک انگریج نے اسٹیشن پر میرا فوٹو لیا تھا. اور مجھے پانچ روپے کی بخشش بھی دی تھی. بہت لوگ میرا فوٹو لیتے ہیں ۔ "

" یہ فوٹو نہیں ہے ۔ "

" تو کیا ہے ؟ "

" یہ تصویر ہے اِسے برش سے، اس رنگ سے ، اس کاغذ پر بناتے ہیں ۔ "

" اس میں کتنا ٹائم لگے گا ؟ "

" یہ تصویر دس دن میں بھی بن سکتی ہے. دس مہینوں میں بھی بن سکتی ہے دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔ "

" تو کیا میں دس سال تک تمھاری جیل میں رہونگی ؟ "

"نہیں، جب میں تمہارے نئے گھر آ کر تمہاری تصویر بنایا کروں گا۔"

"میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔" یکایک لاچی اداس ہو گئی۔ "ہوتا اگر گل سے میری شادی ہو جاتی۔"

"گل؟ وہی پٹھان جو تم سے ملنے آتا ہے؟" خوب چند نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تم اس سے پیار کرتی ہو۔؟"

"زندگی سے زیادہ چاہتی ہوں بالو! ایک بات مانو گے؟" لاچی نے یکایک پُر اُمید ہو کے پوچھا۔

"بتاؤ۔؟"

"گل کو بھی جیل میں رکھ لو۔ اُسے بھی یہیں کہیں ایک کوٹھری دیدو۔ تمہارے اِدھر تو بہت جگہ ہے ہم دونوں کہیں رہ لیں گے۔ یہیں اپنا گھر بنالیں گے۔"

خوب چند خوب ہنسا

بولا۔

"پگلی جیل میں تو مجرم آتے ہیں سزا کاٹنے کیلئے، کیا تمھیں باہر کی دنیا میں اور جیل کی دنیا میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا؟"

لاچی نے بہت سنجیدگی سے سر ہلا کے کہا۔

" باہر کی دنیا بھی ایک جیل ہے بالو! فرق اتنا ہے کہ اس میں لوہے کی سلاخیں نہیں ہوتیں۔"

لاچی خوب چند کیطرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر خلاء میں کہیں دیکھ رہی تھیں۔ خوب چند اس کے سوچ میں ڈوبے ہوئے حسن سے مبہوت اُسے دیکھتا رہا۔

یکایک لاچی مڑی تو خوب چند بھی گھبرا کے ایزل کیطرف پلٹا۔ لاچی نے ہنس کے کہا۔

" ارے بالو تم نے تو ابھی تصویر شروع بھی نہیں کی۔ یہ کاغذ کورا ہے ___"

" ابھی میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

" مجھے سمجھنے کی کوشش؟ مجھ میں کیا ہے؟ میں تو بس لاچی ہوں۔"

" یہی تو مشکل ہے؟"

" کیا؟"

" کچھ نہیں۔" خوب چند ذرا تلخی سے بولا۔ " تم اسٹول پر چپکی کھڑی رہو۔ اور اپنی جگہ سے ہلو نہیں۔ اور کوئی بات بھی مت کرو۔"

" یہ تو بہت مشکل ہے۔ "

" مگر اس کے بغیر تصویر نہیں بن سکتی۔ "

" بہت اچھا، اب میں بالکل چپ رہوں گی۔ "

لاچی نے اپنے منہ پر انگلی رکھ دی۔

خوب چند نے پوز دیا۔

اور وہ اسی پوز میں چند منٹ ساکت کھڑی رہی۔ خوب چند ایزل پر تصویر بنانے لگا۔

چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

" بابو مجھے پیاس لگی ہے ! "

اب خوب چند اس کیلئے پانی لے کر آیا۔

پھر چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

" بابو! اگر کل بھی کسی کو مار کے یہاں آجائے تو تم اُسے اپنی جیل میں جگہ دو گے ؟ "

" کس کو مار کے آئیگا ؟ "

" کسی کو بھی مار دے گا۔ اس دنیا میں بہت ظالم ہیں۔ "

" مارنا گناہ ہے جرم نہیں ہے! اور فرض کر لو کل تو ڈھائی سال کی سزا نہ ہوئی عمر قید ہو گئی ؟ "

" تو میں بھی زندگی بھر اس کیساتھ جیل میں رہونگی ۔ "

" فرض کرلو اُسے پھانسی ہوگئی ؟ "

" باپ رے ! تو یہ تو غلط بات ہوگی ! "

لاچی نے ایک دم کہا ۔

پھر سوچ سوچ کر بولی ۔

" اچھا تم تصویر بناؤ ۔ اب میں کچھ نہ کہوں گی ۔ "

وہ پھر پوز لے کر کھڑی ہوگئی ۔

خوب چند نے اس سے تہدیدی انداز میں کہا ۔

" اب ہلنا مت اپنی جگہ سے ۔ "

مشکل سے آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ لاچی نے کہا ۔

" بابو ! تم جیل کے سب سے بڑے بابو ہو ؟ "

" ہاں ! میں سپرنٹنڈنٹ جیل ہوں ۔ "

" سپری ٹان ۔ ؟ "

لاچی نے رُکتے رُکتے اس کا عہدہ یاد کرتے ہوئے کہا ۔

" ہاں سپری ٹان ۔ ! "

خوب چند ہنسا ۔

" اور سپری ٹان سے بڑا جیل کا بابو اور کوئی نہیں ہوتا ؟ "

لاچی نے پوچھا۔

"ہوتا ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر جیل۔"

"ڈپٹی جرنیل؟ اس سے بڑا بابو کون ہوتا ہے؟"

"اس سے بڑا جرنیل ہوتا ہے۔"

خوبچند نے ہنس کر کہا۔

"اور اس سے بڑا کون ہوتا ہے؟"

"اور اس سے بڑا خدا ہوتا ہے۔" خوب چند نے گویا معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

لاچی چپ ہو گئی۔ دیر تک چپ رہی۔ پھر آہستہ سے بولی ۔

"خدا بھی مرد ہے، اس سنسار میں جتنے بھی بڑے بابو ہیں سبھی مرد ہیں۔ پھر مجھے انصاف کہاں سے ملے گا؟"

خوب چند چونک گیا۔ وہ پلٹ کر لاچی کیطرف دیکھنے لگا مگر لاچی کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ اُسے مطلق کوئی احساس نہ تھا کہ اس نے کیا بات کہہ دی۔

وہ پوز لئے، دف اونچا کئے چپ چاپ کھڑی تھی —

خوبچند دیر تک اُسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر گھوم کر ایزل پر

تصویر شروع کرنے لگا۔

لاچی یکایک اچھل کر لکڑی کے اسٹول سے نیچے آگئی۔

خوب چند نے گھبرا کے پوچھا۔

"کیا ہے ؟"

"کچھ نہیں، میرے ٹخنوں پر خارش ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر لاچی اپنے ناخنوں سے اپنے ٹخنے کھجلانے لگی۔

خوب چند اس کی بے تکلف معصومیت پر مسکرا دیا۔

لاچی کے مقدمے نے اسٹیشن یارڈ کے علاقے کے لوگوں
کیلئے دلچسپی کا سامان مہیا کردیا تھا۔ پولیس کی دوڑ دھوپ، اخباری رپورٹروں
کے انٹرویو، خانہ بدوشوں کے قبیلے کی تصاویر نے خاصا ہنگامہ بپا کردیا تھا۔
جتنے منہ اتنی باتیں، کچھ لوگ لاچی کی بہادری کی تعریف کرتے تھے۔ اور
اکثر اس کے خلاف تھے۔ لاچی نے سماج اور قبیلے کے قوانین کو توڑا تھا۔
اور یہ دونوں ادارے اتنی آسانی سے اُسے معاف کردینے کیلئے تیار نہ
تھے۔ پلاسٹک مل کے مالک کا نام بھی اس مقدمے کے دوران میں لیا
گیا تھا۔ اور اس کی گواہی بھی ہوئی تھی۔ پلاسٹک مل کا مالک اس علاقے کا

سربرآوردہ آدمی تھا، اس نے اس مقدمے سے نکلنے کیلئے اپنا پورا رسوخ استعمال کیا تھا۔ صرف یہی نہیں، اس نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی تھی۔ کہ لاچی کسیطرح اس مقدمے کے جنگل سے نہ بچ نکلے۔ حالانکہ لاچی کے دلیرانہ بیان اور اقبالِ جرم کے بعد اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر بھی پلاسٹک مل کے مالک کی کوشش یہی رہی۔ کہ لاچی کو اس مقدمے میں زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔

مردوں کا سماج ہو یا مردوں کا قبیلہ ہو وہ عورت کے بہت سے گناہوں کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں لیکن وہ ہرگز ہرگز یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی عورت ان سے باغی ہو کر اپنی حرمت کی حفاظت کیلئے لاچی کیطرح زندگی کی بازی لگا دے۔ کیونکہ اس کا اثر دوسری عورتوں پر بہت بُرا پڑتا ہے اور ہوا بھی یہی تھا۔

مقدمے کا سب سے بڑا اثر قبیلے کی عورتوں پر پڑا تھا۔ نوجوان عورتوں نے ایک ایک کر کے بُرے دھندے سے انکار کر دیا۔ ان کے شوہر خفا تھے، قبیلے کا سردار خفا تھا۔ قبیلے کی بوڑھی عورتیں خفا تھیں۔ لیکن لاچی کی دلیرانہ مدافعت نے صدیوں کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں۔ اور وہ طوفان جو ہر عورت کے سینے میں لہریں لیتا ہے۔ سینہ توڑ کر باہر آگیا تھا۔ اور غم و غصہ سے بھری ہوئی نوجوان خانہ بدوش عورتوں کے چہروں پر پھیل رہا تھا۔

اب وہ مرغی چرائیں یا کوئلہ چرائیں، ٹوکریاں بنیں یا چاندی کے چھلے بیچیں، یا محنت مزدوری کا کوئی اور کام کریں۔ لیکن اب وہ اپنی عزت بیچنے پر تیار نہ تھیں۔ اور اب وہ طعنے دے دیکر اپنے خاوندوں کو شرم دلانے لگیں کہ محنت کرنا سیکھیں۔ تین لڑکیاں تو قبیلے سے بھاگ گئی تھیں اور انھوں نے شہر کے غریب لیکن محنتی نوجوانوں سے شادیاں کرلی تھیں۔ قبیلے میں پھوٹ پڑگئی تھی۔ اور طوفان کے پہلے ہی ریلے میں پرانے رسم و رواج خس و خاشاک کیطرح بہہ گئے تھے اور اٹھتی ہوئی بغاوت کی موجوں کے زور نے اس قبیلے کو اس کی مرضی کے خلاف بیسویں صدی کیطرف دھکیل دیا تھا۔

یونہی ہوتا ہے اور بہت سے لوگوں کی زندگی میں، ہر دور میں اور ہر سماج میں یونہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتے، اپنی زنجیروں سے، اپنی عادات سے، رسم و رواج سے، اندھے مذہبی اور سماجی عقائد سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں، لیکن بغاوت کی قوتیں انھیں اپنے طوفانی ریلے میں بہا کر آگے منزل کیطرف دھکیل کر روانہ کردیتی ہیں۔ اور ان میں اتنی شدت اور قوت ہوتی ہے کہ ہر قدم پر پرانے توہمات کا سہارا لینے والا انسان اپنی مدافعت نہیں کرسکتا اور آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قبیلے پر جو ردِ عمل ہوا تھا۔ اس نے اسٹیشن یارڈ کے سارے علاقے کے سماج میں ایک کھلبلی سی پیدا کر دی تھی۔ مختلف قوتیں جمع ہو کر قبیلے کے خلاف حرکت کر رہی تھیں۔ اور یہ بہت ہی آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر ہوا قبیلے کی عورتیں علاقے کے اوباش لوگوں کیلئے ایک بہت بڑا سہارا تھیں۔ اور بڑا سستا سہارا تھیں۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیوں کی بغاوت سے دلالوں کے پیشے پر کاری ضرب پڑی تھی۔ پھول والوں کی دکانوں کی بکری کم ہو گئی تھی۔ رات پانی کرنیوالی ٹیکسیوں کا دھندا کم ہو گیا۔ اور ناجائز شراب بیچنے والوں کے کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ اس کے ساتھ اگر پلاسٹک مل کے مالک کی دشمنی کو ملا لیجئے جس کا علاقے کے ہر کونے میں اثر و رسوخ تھا تو قبیلے کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کا جو جذبہ بڑھ رہا تھا، اسکی ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں آ جائے گی۔

دھیرے دھیرے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس قبیلے کا فائدہ کیا ہے اور یہ قبیلہ ہمارے علاقے میں اتنے عرصے سے —— بے اطمینانی پھیلا رہا ہے۔ اس طرح کے سوچنے والے بہت سے لوگ تھے۔ اور طرح طرح کے لوگ تھے اور صرف بُرے ہی لوگ نہ تھے جنھیں قبیلے کی عورتوں کے رویّے نے تکلیف پہنچائی تھی۔ لاچی کے مقدمے سے شہ پا کر شریف لوگ بھی میدان میں آ گئے تھے۔

شریف گھرانوں کی عورتوں اور بہوؤں نے بھی اپنے خاوندوں
کو محض اپنے تحفظ کی خاطر اس قبیلے کے خلاف اکسا دیا تھا۔ جب تک
یہ قبیلہ یہاں رہے گا انھیں اپنے خاوندوں کے بہک جانے کا ڈر تھا۔
لاچی کے مقدمے نے قبیلے کی گندگی سطح پر اچھال دی تھی۔
اور اب ہر شریف آدمی اور ہر بڑا آدمی اپنی ناک پر رومال رکھے ہوئے اس
کی عفونت سے بیزار نظر آتا تھا
یہ لوگ چور ہیں
ڈاکو ہیں
جرائم پیشہ ہیں
آوارہ مزاج اور کام چور ہیں۔
سوسائٹی پر بدنما دھبہ ہیں۔
یہ لوگ ہمارے علاقے میں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔
میونسپلٹی نے آخر انھیں کیوں پناہ دے رکھی ہے؟
ریل کی پٹری ان لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے خطرے میں ہے۔
ان لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔ یہ لوگ کسی وقت بھی
دیش اور قوم کیلئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔
جتنے منہ اتنی باتیں۔

دھیرے دھیرے جوں جوں مقدمہ اختتام کو پہنچتا گیا۔ ان لوگوں کا جوش قبیلے کے خلاف شدید ہوگیا۔ اپنی عفونت کو چھپانے کیلئے ہر الزام خانہ بدوشوں پر لگایا جانے لگا۔ یہ تو لوگ بھول گئے کہ ہر لغزش کرنیوالی عورت کے بالمقابل شریف سوسائٹی کا ایک فرد بھی کھڑا تھا۔ لیکن یہ تمام افراد بیحد شریف، گھر والے، نوکریوں والے یا کام کاج کرنیوالے یعنی ان کے اپنے آدمی تھے۔ اس لئے سب اپنے آدمی اپنی عزت بچانے کیلئے تل گئے تھے اور قبیلے کے خلاف غیض و غضب کا مظاہرہ کرنے کیلئے تیار تھے۔

ہر سماج اپنے گناہ چھپانے کیلئے کسی باہر والے کو قربانی کا بکرا بناتا ہے۔ ذات سے باہر یا سوسائٹی سے باہر یا ملک سے باہر یا قوم سے باہر یا عقیدے سے باہر، اس بکرے کی ضرورت ہر سوسائٹی میں یکساں ہے۔ اور اس بکرے کے بغیر کوئی سوسائٹی یا سماج چاہے وہ پسماندہ سے پسماندہ ہو یا ترقی یافتہ ہو، چل نہیں سکتا۔

خاص خاص بحرانی کیفیتوں میں اس بکرے کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے۔ اس بکرے کی جان لیکر، اس کا لہو پی کر ہر سماج ایک طرح سے گویا اپنی تجدیدِ حیات کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

انسانی تاریخ اگر ایک طرف شہیدوں کے خون سے روشن ہے تو دوسری طرف بکروں کے لہو سے بھی سرخ ہے۔ فرق صرف اتنا

ہے کہ شہیدوں کا ذکر لوگ فخر سے کرتے ہیں لیکن بکروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا. اور اگر کبھی بکروں کا ذکر ناگزیر ہو جائے تو شرم سے سر جھکا کر سرگوشیوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے. یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے شہیدوں کے نام تو جانتے ہیں لیکن اپنے بکروں کے نہیں.

جس دن لاچی کو سزا ہوئی۔ اور حلاتے کا منہ کالا ہوا اور مقدمہ کی ساری روداد اور جج کا فیصلہ اخباروں میں چھپا، حلاتے کے لوگوں کی خفت بڑھنے لگی. دھیرے دھیرے سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ لاچی کی سزا کے دس دن بعد حمیدا ٹیکسی ڈرائیور نے کملا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا.

"آج رات کو جشن ہے."

"کہاں۔؟"

کملا کر نے پوچھا.

"اسٹیشن یارڈ کے اس پار۔"

یہ کہہ کر حمیدے نے آنکھ ماری. کملا کر کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا، لیکن جو کچھ اس نے سمجھا وہ اتنا کافی تھا کہ اسے مزید دریافت کرنے کی حاجت نہ ہوئی.

"کچھ ساتھ لیتا آؤں۔"

"ہاں۔"

" اور ۔ ؟ "

" اور کیا، آدھی بوتل چڑھا کر آنا۔ ورنہ جشن میں لطف نہ آئے گا ؟"
مادھو فروٹ والے سے پان والے نے کہا۔

" آج رات کو جشن ہے ۔ "

مادھو چونک پڑا۔

" ہوں ؟ "

" ہاں ۔ ! "

" کب ؟ "

" آدھی رات کو، چلو گے ؟ "

" چلوں گا ! " مادھو کی بوٹی بوٹی فرطِ شوق سے کانپنے لگی۔
تھوڑی دیر کے بعد مادھو نے پوچھا۔

" اکیلا آؤں ؟ "

" اگر کوئی دوست نہ ملے تو اکیلے ہی آجانا۔ لیکن اگر کچھ لوگ ساتھ لاسکو تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ "

" میرے دوستوں میں دس بارہ دودھ بیچنے والے لاٹھی چکیت بھیا بھی ہیں۔ اگر کہو تو انھیں بھی ساتھ لیتا آؤں۔ "

" ضرور ضرور، سب کو ساتھ لیتے آؤ، بڑا مزا رہے گا۔ "

پلاسٹک مل کے مالک نے شہر کے ایک اڈے پر ٹیلیفون کیا۔

"چنتا منی! آج ہی سب آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔"

چنتا منی ہر طرح کا دھندا کرتا تھا، چرس کا، افیون کا، گانجے کا، کوکین کا، قمار بازی کا، بُری عورتوں کا، شراب کا، قتل کا، بے حد شریف قابلِ اعتبار اور ایماندار مجرم تھا، کئی بار تڑی پار بھی شہر بدر ہو چکا تھا۔ اس لیے جرائم کی دنیا میں اس کی شرافت اور کاروبار کی دنیا میں ایمانداری مسلّم تھی۔ اس نے ٹیلی فون پر کہا۔

"کس وقت چاہئیں مالک؟"

"آج رات کے دس بجے، اگر وہ مِل کے پھاٹک پر آجائیں تو انھیں ہر طرح کی ہدایات مل جائینگی۔"

"بہت اچھا مالک۔"

کہہ کر چنتا منی نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھ دیا۔ اور انتظام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جشن کا وقت قریب آنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے، دھیرے دھیرے اسٹیشن یارڈ کے علاقے میں لوگ دو، دو، چار چار، دس بیس کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ فضا میں جیسے بجلی کی مضطرب سی لہریں گھوم رہی ہوں۔

غبی سے غبی آدمی بھی ہوا سونگھ کر کہہ سکتا تھا۔

" آج کچھ ہونے والا ہے۔"

جوں جوں لوگوں کی ٹولیاں بڑھتی جا رہی تھیں پولیس والے کم ہوتے جا رہے تھے، گیارہ بجے ناکے پر پولیس کا ایک آدمی بھی نظر نہ آتا تھا۔ آج سرِ شام ہی سے علاقے کی دکانیں بند ہو گئی تھیں لیکن لوگوں کی ٹولیوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے کسی میلے کا اہتمام ہوا ہو۔

گل کے کان میں بھی کسی نے کچھ کہا۔ مگر بےحد مبہم اور پراسرار کوئی بات واضح اور صاف نہ تھی۔ کیونکہ بیشتر لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ کہ کیا ہونے والا ہے؟ بس یہی معلوم تھا کہ کچھ ہوگا، آج شب کچھ ہوگا کب ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کس وقت ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اس کے متعلق کوئی مصدقہ اطلاع نہ تھی۔

اکثر اس قسم کے موقعوں پر یہی کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ایک پُراسرار تذبذب میں رکھ کر ان کی بےچینی کو کھولتے ہوئے نقطے پر لے جا کر ان کے اضطراب کا دھارا یک لخت موڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر، جدھر پلان کرنے والے چاہتے ہیں۔ آگے چل کر ماب (MOB) کی نفسیات اپنا کام کرتی ہے۔ بُرا ہو یا بھلا۔ اس کے بارے میں اس وقت سوچنے کی ضرورت کسے ہوتی ہے۔ صرف سوچنے والوں نے

پہلے سوچا ہوتا ہے " ماب " میں شامل ہونے والے لوگ بعد میں سوچا کرتے ہیں اور جن لوگوں نے پہلے سے سب کچھ سوچا اور سمجھا ہوتا ہے۔

وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ یہ بعد میں سوچیں گے جب بہت دیر ہو جائے گی اور پہلے سے سوچنے والوں کا کام بن چکا ہوگا۔ کوئی دس بجے کے قریب چنتا منی اپنے آدمیوں کو لے کر مل کے پھاٹک پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں پر اُسے جو ہدایات ملیں وہ یہ تھیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو شراب پلائے۔ اسے اس کام کیلئے پیسے بھی دیئے گئے۔ اس کے بعد شراب پلانا کیا مشکل تھا۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ میں سامنے جو چھپر نما گھر تھے۔

ان میں دیسی شراب کی کشید ہوتی تھی۔ جس سے کارخانے میں کام کرنیوالے لوگ کبھی کبھی اپنے تھکے ہوئے اعضاء کو سکون پہنچایا کرتے تھے یہ لوگ دس سے بارہ بجے تک ان چھپروں میں بیٹھے ہوئے شراب پیتے رہے۔ تلی ہوئی مچھلی اور کباب کھاتے رہے۔ شراب پانی کیطرح بہہ رہی تھی۔ اور لوگوں کی گفتگو کا دھارا سمندر کی طرح موجیں مار رہا تھا۔

جب عقل سلیم کے سارے اجزاء الکوحل میں حل ہو گئے تو

چنتامنی کو دوسری ہدایت ملی اور روپیہ بھی اس کی جیب میں پہنچا دیا گیا۔

چنتامنی اپنے قابلِ اعتماد لفٹیننٹ سورج کو چھپروں میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تین آدمی اس نے اپنے ساتھ لئے، تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو ان لوگوں کے پاس مٹی کے تیل کے بڑے بڑے پیپے تھے اور آگ لگانے کا ضروری سامان تھا۔

رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب آخری میل اسٹیشن سے گزر گیا۔ اور اس کے بعد آنیوالی گاڑی تین گھنٹے کے بعد آتی تھی۔ اس وقت اسٹیشن یارڈ کے دوسرے سرے سے آگ کے شعلوں کا ایک لپکا سا بلند ہوا۔ اور کسی نے چلّا کر کہا۔

" خانہ بدوشوں کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ "

اور پھر اسی وقت حمید سے نے چلّا کر کہا۔

" یا علیؑ ! "

مادھو کی ٹولی لاٹھیاں اٹھا کر دوڑی اور ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے ہوئے اسٹیشن کے اندر بلا ٹکٹ گھس گئی۔ اور ریل کی پٹریاں پار کرتے ہوئے خانہ بدوشوں کے قبیلے کیطرف بڑھنے لگی۔

یک بیک چاروں طرف سے ہلا بول دیا گیا۔

لوگ لاٹھیاں گھماتے اور چاقو کھولے دوڑ رہے تھے۔ لوہے کے جنگلے سے سلاخیں نکال لی گئیں۔ چھپروں سے لکڑیاں نکال لی گئیں۔ ہر شخص کے منہ سے شراب کی بُو آتی تھی۔ آنکھوں میں درندوں کی سی چمک تھی۔ اور ٹانگوں میں بھیڑیئے کی سی تیزی تھی۔ اور نتھنے پھولے ہوئے، شکار کو سونگھتے ہوئے، دو منٹ میں اپنی تہذیب کے سارے پردے چاک کر کے انسان جنگل کی فضا میں پہنچ گیا تھا اور چوکڑیاں بھرتا ہوا شکار کی تلاش میں دوڑا جا رہا تھا۔ وہ لوگ کون تھے؟ ان سے ان کی کیا دشمنی تھی۔ ان لوگوں نے کسی کا کچھ بگاڑا تھا۔ یہ سب خیال اس وقت دب گئے تھے۔ صرف ایک منزل سامنے تھی۔

شکار!

شکار!!

شکار!!!

جنگل کا خون پکار رہا تھا۔

گُل پُرانے پل سے دیکھ رہا تھا۔

خانہ بدوشوں کے خیموں سے بھرے ہوئے میدان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ ان کے خیموں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ خانہ بدوش بڑی جیداری سے مدافعت کر رہے تھے لیکن وہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے۔ اور حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ حملہ اچانک ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہوا تھا۔ اس لئے خانہ بدوشوں کی بستی میں ہراس پھیل گیا تھا۔ خانہ بدوش بچے چیخ رہے تھے۔ خانہ بدوش عورتیں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھیں۔ اور اپنی اپنی مدافعت میں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھیں۔ گل پل پر سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک عجیب سی حدت اس کے دل سے اٹھی۔

یہ اس کے دشمنوں کا قبیلہ تھا۔ پھر بھی اس کی لاچی کا قبیلہ تھا۔ وہ لاچی جو اس کی وجہ سے جیل میں تھی۔ اس قبیلے میں اس کے ماں باپ تھے، بہت بُرے، بیحد بُرے، پھر بھی اس کی لاچی کے ماں باپ تھے۔

وہ پل پر کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔

اور پھر دوسرے لمحے میں تیز تیز قدموں سے نیچے میدان کی طرف چلا گیا۔ لیکن گل وہاں کیا کر سکتا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے اور گل اکیلا تھا۔ اکیلا آدمی کتنے آدمیوں سے لڑ سکتا ہے؟ جب لاٹھی کا ایک اوچھا وار اس کی ٹانگ پر پڑا تو وہ ایک کونے میں گر گیا اور چکرا کر اوندھا ہو گیا۔ اگلے چند لمحوں میں دو چار قدم اس کے جسم کو روندتے

ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اُسے ان قدموں کے بوجھ کا اتنا احساس نہ تھا جس قدر اپنی ٹانگ میں درد کا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا۔ اور لنگڑاتا ہوا واپس پرانے پل کو ہو لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پولیس کو ٹیلی فون کرے لیکن اب اسے یہ سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس بلندی سے اُس پستی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا جہاں انسان بستے تھے۔

خانہ بدوشوں کے خیمے جل رہے تھے۔

لوگ مشعلیں اٹھائے خانہ بدوشوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بہت سے خانہ بدوش اور ان کی عورتیں بھاگ گئی تھیں۔ بچے ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے رو رہے تھے اور معصومیت میں حملہ آوروں سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

ایک غنڈے نے ایک خانہ بدوش عورت کو پکڑ لیا تھا۔ اور وہ چاقو سے چیر چیر کر اس کے کپڑے اتار رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے بھی کپڑے اتار سکتا تھا۔ مگر شاید اُسے چاقو سے چیرنے میں زیادہ مزا آرہا تھا۔ وہ ایک ایک کپڑا چیر کر خانہ بدوش عورت کو ننگا کر رہا تھا۔ ہوتے ہوتے اس خانہ بدوش عورت کے گرد غنڈوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔

وہ لوگ شراب کی بوتلیں منہ سے لگائے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گل نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ پھر دوڑتا

ہوا اسٹیشن یارڈ سے باہر نکل گیا اور سیدھا پولیس چوکی کیطرف چلا گیا۔ مگر پولیس کے آنےسے پہلے ہی غنڈوں کو خبر ہو چکی تھی۔ اور جب تک پولیس آئے غنڈے اپنا کام کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔

چنانچہ جب پولیس واردات کے موقع پر پہنچی تو اُسے ایک مجرم بھی نہ ملا۔

میدان صاف تھا۔

خانہ بدوشوں کے خیمے ابھی تک جل رہے تھے۔

پانچ چھ خانہ بدوش سخت زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔

ٹوٹی ہوئی صراحیاں، گھڑے، تسلے، ایلومونیم کے برتن میدان میں بکھرے پڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے مختلف کونوں میں چھپے ہوئے سسک سسک کر رو رہے تھے، بچے جن کی آنکھوں کے سامنے ان کی ماؤں کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ ان کے باپوں کو مارا پیٹا گیا تھا۔ شیطان کے چیلے درندگی اور بربریت کا رقص تمام کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ مظلوم وہاں موجود تھے۔

لیکن مجرم کہیں نظر نہ آتا تھا۔

پولیس فوراً بیانات قلم بند کرنے لگی۔ سپاہی اور سنتری ناکوں اور علاقہ کے کوچوں میں گشت کرنے لگے۔ چند لوگ گرفتار بھی کئے

گئے۔ لیکن ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو اس واردات میں شامل نہ تھے بلکہ اپنے گھروں میں سوئے ہوئے تھے اور جنھیں اس واقعے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

بکھرے !

دوسری صبح کو خانہ بدوشوں کا قبیلہ وہاں سے جا چکا تھا۔ میدان خالی تھا، وہاں چند جلے ہوئے خیمے تھے۔ اور چند گڑھے اور کچھ قدموں کے نشان! دس بارہ روز میں یہ بھی مٹ جائیں گے اور پھر وہاں اس خونچکاں داستان کا کوئی نشان بھی نہ رہے گا۔

خانہ بدوش اسٹیشن کے علاقے کو خالی کر گئے ہمیشہ کیلئے اب وہ پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ خدا جانے وہ کدھر جائیں گے اور کہاں اپنا ڈیرہ جمائیں گے۔ مگر اب وہ اس علاقے میں واپس نہ آئیں گے۔ علاقے کے لوگوں نے اس بدنما دھبے کو ہمیشہ کیلئے اپنے علاقے سے مٹا دیا تھا اور اب علاقے میں کسی طرح کی بے اطمینانی نہ تھی۔ دوسرے دن دکانیں بڑے اطمینان سے کھلیں۔ لوگ باگ آنے جانے لگے۔

پان والے۔

فروٹ والے۔

ٹیکسی والے۔

سب اپنے اپنے گاہکوں کی مانگ پوری کرنے میں مصروف تھے۔ آگ لگانیوالے بس کے کیو میں کھڑے ہوکر اپنے گھر کیلئے تھیلیوں میں کچھ سلے جارہے تھے۔ جن لوگوں نے کل رات خانہ بدوش عورتوں کی بے حرمتی کی تھی وہ اس وقت سبز پتوں میں پھولوں کی وینیاں لپیٹے ہوئے اپنی عورتوں کیلئے جارہے تھے۔

زندگی بالکل ٹھیک تھی اور درست تھی اور صحیح تھی اور بالکل اسی طرح تھی جس طرح اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ صرف گل کو کچھ عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ اور جب ملاقات کے دن اس نے لاچی سے مل کر یہ سب کہا تو اس کا دل تڑپنے لگا اور اس کے دل میں ایک نامعلوم سڑک کی یاد آئی۔ جو پہاڑوں اور میدانوں اور وادیوں میں سے گزرتی جاتی ہے۔ اور جس پر خانہ بدوشوں کا قافلہ کسی موہوم منزل کی تلاش میں ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔

اس نے گھبرا کر گل کے سینے پر سر رکھ دیا!

اور پھوٹ کر رونے لگی!!

خوب چند نے منع کر دیا تھا۔ پھر بھی لاچی کی تصویر کی بات آہستہ آہستہ ساری جیل میں پھیلتی گئی۔ عورتوں کی جیل میں جب اس بات کا پتہ چلا تو بہت ساری عورتیں جنیاں بائی کے توسط سے لاچی کو دیکھنے کیلئے آنے لگیں۔ اور اس سے دوستی کی خواہش ظاہر کرنے لگیں۔ ان میں مشہور فلم اسٹار دل آرا بھی تھی جسے دھوکا دینے کے جرم میں ساڑھے تین سال قید کی سزا ہوئی تھی۔

دل آرا کا قد لاچی کے قد سے بھی لانبا تھا۔ جلد آئینے کی طرح شفاف تھی۔ رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

اور آنکھوں میں کنول کی سی پاکیزگی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی ایک لمحے کیلئے بھی خیال نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عورت کسی طرح کا دھوکا کر سکتی ہے۔ اس لئے جب وہ پہلی بار لاچی سے ملی تو لاچی کو اس کے جرم کی تفصیل سن کر بڑا اچنبھا ہوا۔

وہ اس وقت سرکل کے میدان میں جامن کے پیڑ کے نیچے گھاس چھیل رہی تھی۔ جب جیناں دل آرا کو اس کے پاس چھوڑ گئی تو دونوں عورتیں کھرپی لے کر گھاس چھیلتے چھیلتے باتیں کرنے لگیں۔

لاچی نے مسکرا کر کہا۔

"تم تو ایسی لگتی ہو کہ تم سے دھوکا کیا جا سکتا ہے تم کسی کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

دل آرا ہنس کر بولی۔

"نہیں، میں نے تو واقعی دھوکا دیا تھا۔ وہ سندھی سیٹھ بڑا چالاک بنتا تھا۔ میں نے اس سے تیس ہزار روپے اینٹھ لئے۔"

"کاہے کیلئے؟"

"مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔"

لاچی کو اپنی بات یاد آئی۔

درست ہے۔ روپوں کی ضرورت یوں تو ہمیشہ رہتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی بڑی رقم کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ ایک معمولی سی رقم کیلئے اس نے خون کر دیا تھا۔ اس تیس ہزار کے دھوکے میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ضرور کوئی اہم معاملہ ہوگا۔ جبھی تو اس عورت نے اتنا بڑا دھوکا دیا۔

لاچی کو کُرید لگی۔

اس نے پوچھا

"تم فلم میں کام کر کے کتنا کما لیتی ہو؟"

"میں پندرہ بیس ہزار روپے مہینہ کما لیتی ہوں۔"

"پھر تم نے تیس ہزار روپے کیلئے دھوکا کیوں دیا؟"

"میں ایک گاڑی خریدنا چاہتی تھی۔ ایک مہاراجہ اُسے ساٹھ ہزار روپے میں دے رہا تھا۔ اور وہ ایسی پیاری گاڑی تھی کہ ساٹھ ہزار روپے میں بھی سستی تھی۔ لیکن اتنی رقم میرے پاس نہ تھی اور یہ سندھی سیٹھ ایک عرصے سے میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں نے اُسے بیوقوف بنایا۔"

"ایک گاڑی کیلئے؟ کیا تمہارے پاس اس سے پہلے کوئی گاڑی نہ تھی؟"

"ہُنہہ، دو تھیں، مگر میں تو یہ نئی والی گاڑی لینا چاہتی تھی۔

اور تم دیکھو گی اسے تو جان نکل جائے گی کیسی پیاری سویٹ گاڑی ہے سلور گرے !"

دل آرا نے کھرپی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ فرطِ مسرت سے اپنے سینے پر رکھ لئے اس کی ہتھیلیوں میں سلور گرے گاڑی چمک رہی تھی۔

لاچی بہت دیر تک کچھ نہ بولی۔

وہ سر جھکائے کھرپی سے گھاس کھودتی رہی۔

اس کی کچھ بہنیں تھیں۔ پرانے رسم و رواج میں جکڑی ہوئیں۔ غربت اور بھوک اور جہالت کا شکار، اگر وہ عورتیں چوری کرتی تھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔ یہ ایک نئی گاڑی کیلئے دھوکا دینے کی بات لاچی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور پھر جب کسی کے پاس دو گاڑیاں پہلے سے موجود ہوں۔ لاچی نے نگاہ اٹھائی۔ دل آرا کو دیکھا، کتنی پیاری خوبصورت سی لڑکی تھی۔ یقیناً کوئی موٹر اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتی۔ انسان ایک بڑھیا خوبصورتی کو بیچ کر ایک گھٹیا خوبصورتی کیوں مول لیتا ہے؟ یہ کیسا سودا ہے؟"

یکایک لاچی نے غصے سے کہا۔

" تمہیں ایک ذلیل لوہے کی گاڑی کیلئے دھوکا دیتے شرم

نہ آئی۔

دل آرا نے لاجی کی طرف بڑے اطمینان سے دیکھا۔
اُسے ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ پھر وہ ذرا مسکرائی۔ مگر جب اس نے لاجی کی آنکھوں سے ایمان اور صداقت کے شعلے نکلتے دیکھے تو وہ ان کی چمک کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ وہ گھاس کی جڑ سے بھوری مٹی جھاڑتے ہوئے بولی۔

"میں جب سات سال کی تھی تو پہلی بار بیچی گئی تھی، خود میرے ماں باپ نے مجھے آٹھ سو روپوں میں بیچ دیا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گی"

"کر سکتی ہوں۔" لاجی بولی۔ "ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے خود مجھ سے ہو چکا ہے۔"

"سات سال سے سترہ سال تک میں دس بار بیچی گئی ہوں ہر سال میرا باپ بدل جاتا تھا۔ ہر سال میرا ایک نیا خریدار مجھے خریدا کرتا تھا۔ ہر سال میری قیمت بڑھ جاتی تھی کیونکہ میں بہت خوبصورت ہوں نا!"

"ہاں تم بہت خوبصورت ہو!" لاجی نے کہا۔ "بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہو۔"

دل آرا بولی

"جب میں چھوٹی تھی تو میرے خریدار میرے ماں باپ بن جاتے

تھے۔ جب میں بڑی ہوئی تو وہی میرے شوہر ہونے لگے۔ جب میں فلم میں آئی تو کوئی ماں نہ رہی، کوئی باپ نہ رہا، کوئی شوہر نہ رہا۔ سب دلال بن گئے کیا یہ دھوکا نہیں؟ اور اخلاق کیا ہے اس کا مجھے پتہ نہیں۔"

"مگر مجھے معلوم ہے۔"

لاچی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔

کھرپیاں آہستہ آہستہ چلتی رہیں۔

پھر لاچی نے پوچھا

"کیا میں فلم اسٹار بن سکتی ہوں؟"

ذرا کھڑی ہو جاؤ؟"

دل آرا نے اشارہ کیا۔

لاچی کھرپی پھینک کر جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئی۔

اس کے سامنے دل آرا کھڑی ہو گئی۔ اور اُسے مشتاق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارے تم تو ٹوٹ کے کھا جاؤ گی۔"

لاچی ہنستے ہوئے بولی

"حمید ابھی یہی کہتا تھا۔"

"کون حمیدا ؟"

"ایک ٹیکسی والا ہے اُدھر اسٹیشن پر۔"

"ہونھ !" دل آرا نے بڑی تحقیر سے کہا۔ "وہ ٹیکسی والا تمھیں فلم اسٹار کیا بنائے گا۔ میں بنا سکتی ہوں۔"

"سچ ؟ مگر اس کیلئے مجھے کیا کرنا پڑے گا ؟ لاچی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سب سے پہلے تمھیں اپنی عزت دینی ہوگی۔"

لاچی بھنّا کر جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔

"تم بھی، دل آرا ! تم بھی یہی کہتی ہو۔ پھر تو یہ جیل اچھی ہے۔" لاچی نے بڑے استقلال سے کہا اور پھر کھرپی چلانے لگی۔

اتنے میں جیناں بائی دوڑتی ہوئی آئی اور دل آرا سے کہنے لگی۔

"چلو اُدھر دفتر میں، کالی چرن صاحب تمھیں بلاتا ہے۔"

دل آرا نے چونک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے ؟"

"اُدھر ایک پروڈیوسر تم سے ملنے کیلئے آیا ہے۔"

دل آرا نے کھرپی چھوڑ دی۔ روش کے کنارے لگے

ہوئے پانی کے نل سے ہاتھ دھوئے اور جیناں بائی کھسیا تھ کالی چرن
کے دفتر کو چلی گئی ۔

کالی چرن کے دفتر میں حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں
بیٹھے ہوئے تھے ۔ دل آرا اندر آ کے میر چندانی کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور
اس کے سگریٹوں کے ڈبے میں سے ایک سگریٹ نکال کر پینے کیلئے
اپنے منہ میں لگا لیا۔ حاجی اور میر چندانی دونوں نے اپنے لائٹر جلائے
اور آگے بڑھائے ۔

دائیں بائیں دل آرا کے سامنے دو لائیٹر تھے ۔ دل آرا ،
نے دونوں طرف دیکھا۔ پھر اس نے حاجی کیطرف سے منہ پھیر لیا۔ اور
میر چنداتی کے لائٹر پر جھک گئی ۔ ایک لمحے کے بعد اس کے پتلے پتلے
ہونٹوں سے دھوئیں کے نازک نازک سے مرغولے نکلنے لگے ۔ حاجی
نے اداس ہو کر اپنا لائٹر بجھا دیا۔ حاجی دل آرا کو بہت چاہتا تھا۔ اس
کیلئے رات دن آہیں بھرتا تھا۔ وہ اس کیلئے بیس ہزار روپے تک خرچ
کرنے کیلئے تیار تھا۔ مگر دل آرا ، جب بات کرو، ایک لاکھ کی بات کرتی
تھی ۔ اب یہ تو محبت ہے ۔

حاجی نے سوچا، بزنس تو ہے نہیں کہ آدمی ایک لاکھ چھوڑ، دس لاکھ کا جوا بھی کھیل جائے۔ بزنس میں تو رسک لینا پڑتا ہے لیکن محبت میں اتنا رسک کون مول لے۔ اب پندرہ بیس ہزار کی بات ہو تو خیر چلیئے۔ اس رقم کو بھی دل آرا پر قربان کر دیتا۔ مگر یہ کم بخت تو محبت کو بزنس بنائے بیٹھی تھی۔ اب اسے یہ کون سمجھائے کہ محبت محبت اور بزنس بزنس ہے۔ بزنس کو بزنس کے طریقہ پر چلانا چاہیئے اور محبت کو محبت یعنی تفریح کے انداز میں دیکھنا چاہیئے۔ ہونہہ چلیئے۔ کوئی اور مل جائے گی۔ دنیا میں عورتوں اور محبتوں کی کیا کمی ہے؟

اور میر چندانی تو ایک پیسہ دوال نہ تھا۔ اسے دل آرا سے محبت ہی نہ تھی۔ وہ اُسے ایک خوش ذوق کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چند خوشگوار لمحوں کا ساتھ دینے والی ساتھی۔ دونوں کو برج کا بہت شوق تھا اچھے سگرٹیوں کا، اچھے کپڑوں کا، اچھی موٹروں کا، اچھی شراب کا،

عورت اور مرد کے تعلقات تو میر چندانی کیلئے ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ عورتیں میر چندانی کو صرف اس لئے اچھی لگتی تھیں کہ وہ خوش وقتی کا ایک بہت بڑا سہارا تھیں۔ ڈرائینگ روم میں ان کے بھولے بھالے روغنی چہرے، رنگین ساڑیاں کسے ہوئے جسم اور احمقانہ فقرے کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

آدمی ایک دم سٹہ بازار، بلیک مارکیٹ، فریب دہی اور چار سو بیس کی انتہائی زیرک دنیا سے نکل کر ایک دم معصوم، نرم، ملائم اور شیریں دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

بزنس مین کیلئے دن بھر کی جاں لیوا محنت اور تھکن کے بعد عورت ایسی ہی ضروری ہے جیسے سر کے درد کیلئے اسپرو یا اناسین یا کوئی بھی اسطرح کی سفید رنگت کی خوبصورت ٹکیہ، شفاف چکنے کاغذ میں لپٹی ہوئی، عورت اور سر کے درد کی ٹکیہ کی پیکنگ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کم سے کم میر چندانی ایسا ہی سمجھتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ دل آرا، اس سے اتفاق کرتی تھی۔ جسطرح اس کی زندگی گزری تھی، جس طرح وہ بیچی اور خریدی گئی تھی، سماج کے بازار میں بار بار اس کا سودا کیا گیا تھا۔ اُسے مدِنظر رکھتے ہوئے دل آرا، کا دل میر چندانی کے خیالات کی سو فیصدی تائید کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر اپنی بے حد متناسب کلائی میر چندانی کے شانے پر رکھ دی۔ اور بڑی معصوم مسکراہٹ سے حاجی جی کیطرف دیکھ کر بے پروائی سے بولی۔

"حاجی چاچا! کیا پروگرام ہے؟"

"کیوں بے کالیئے تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

حاجی کیطرف سے پلٹ کر اس نے کالی چرن کو اپنی نگاہوں کا نمسکار کیا۔

مردوں کی دنیا میں عورت ہر وقت تیر و کمان سے لیس رہتی ہے۔ بیچاری کیا کرے؟ اس کے قلب و جگر میں نظروں کے نشتر نہ چبھوئے تو وہ اُسے دن رات ایسی مراعات کیوں کردے گا۔"

کالی چرن کا دل دل آراء کو دیکھ کر کانپنے لگتا تھا۔ دل آراء کو خوب معلوم تھا کہ وہ کیوں کانپتا تھا اور کیا چاہتا تھا، جس دن اس کی چاہت پوری کردی، اس کا دل نہ کانپے گا نہ چاہے گا۔ وہ غرور سے گردن اونچی کرے گا۔ فخر سے دنیا کو دیکھے گا اور تحقیر سے دل آراء کو۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ اس خبیث کو کالیہ کہا جائے اور کبھی کبھی جب وہ جھنجھلانے لگے۔ تو اُسے سو پچاس روپے رشوت میں دیدیئے جائیں۔ کیونکہ کالی چرن تو سراپا لالچ تھا۔

اگر تم اس کی ہوس پوری نہیں کرسکتے تو اس کی حرص کی آگ ہی بجھا دو۔ اس کے لئے بہت سے جذبے متبادل تھے۔ اور آخر میں سب روپے میں تبدیل ہو جاتے تھے

عورت کی محبت، ماں کی مامتا، باپ کی بیماری، قیدی کی بیروں، عاشق کی مجبوری، وہ سب کیطرف سے چند لمحوں کیلئے

تعریفی نگاہوں سے دیکھتا۔ گویا ہر جذبے کو اپنے ہاتھ میں لیکر اس کا وزن کرتا۔ اور آخر میں اس پر روپے کا لیبل لگا دیتا۔ اس جذبے کے اتنے پیسے اور اس رعایت کی اتنی قیمت چکا دو۔ کالی چرن تمہارا ہے۔

حاجی عبدالسلام بولے۔

" آج بہت دنوں کے بعد دلدار روڈ پر جانے کو جی چاہ رہا ہے گانا سنیں گے۔ "

دل آرا تو ایسے کاموں کیلئے تیار رہتی تھی۔

فوراً بولی۔

" ارے مزا آجائے گا۔ لکھنؤ میں دو سال میں بھی کوٹھے پر بیٹھی ہوں واہ وا۔ کیا دن تھے وہ۔ پھر سے پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔ ایک ٹھمری میں بھی گاؤں گی۔ "

" تو تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا ؟ "

حاجی عبدالسلام نے پکا کرتے ہوئے کہا۔

دل آرا نے مڑ کر میر چندانی کیطرف دیکھا اور پوچھا۔

" تم نہیں جا رہے ہو ؟ "

میر چندانی بولا۔

" میں سوچ رہا تھا، آج میں رات کو اپنی بھابی کی بہن کی دیورانی کی جٹھانی کی موسی کے یہاں ہو آتا! "

" ارے وہی ڈارلنگ روڈ والی اینگلو انڈین کم بخت! نہیں تم نہیں جا سکتے اور اگر تم گئے تو میں سپرنٹنڈنٹ جیل کو رپورٹ کر دوں گی۔ بجھے ایک ہفتہ ہوا ہے جیل سے باہر نکلے ہوئے تم کیا چاہتے ہو؟ میں یہیں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں۔ "

میر جنیدانی نے سر جھکا دیا۔

بولا۔

" بہت اچھا میڈم! آج گانا سننے چلیں گے جہاں کہو گی وہیں چلیں گے۔ "

حاجی کا منہ اُتر گیا۔

اس نے میر جنیدانی سے مل کر پروگرام بنایا تھا کہ میر جنیدانی تو ڈارلنگ روڈ پر اپنی اینگلو انڈین دوست کے پاس جائے گا اور حاجی دل آرا کو دلدار روڈ پر گانا سننے لے جائیگا۔

مگر اس کم بخت دل آرا نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ اب یہ کمبخت جہاں جائیگی میر جنیدانی کی بغل میں بیٹھے گی۔ اُسے کیا مزا آئے گا۔ خاک! بڑی مشکل سے اس نے کالی چرن کو پانچسو

روپے دیکر آج رات کا پروگرام بنایا تھا مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"تو، تو پھر میرا کیا ہوگا ؟"

بیچارے حاجی نے آخر کہہ ہی دیا

"گھبراؤ نہیں چاچاجی! تمھارے لئے کوئی اور بندوبست کرتے ہیں۔"

"کون ؟"

"لاچی !"

دل آرا بولی۔

"لاچی ؟ حاجی نے پوچھا۔ "عورت ہے وہ ؟"

"عورت نہیں ہے ڈائنامیٹ ہے !"

میر چنذانی نے آہستہ سے کہا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگانے کیلئے ایک ماچس کی تیلی روشن کی اور دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ماچس بجھ گئی اور سگریٹ جوں کا توں اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

کالی چرن نے کھانس کر کہا۔

"میں سمجھا تھا آپ صرف تینوں ہی جائیں گے۔ اب ایک اور بڑھ گیا۔ تو بجھے ایک وارڈر اور آپ لوگوں کیساتھ کرنا پڑے گا۔ دو سو روپے اور ہوں گے۔"

میر چنذانی نے جیب سے دو سو روپے کے نوٹ نکال

کر کالی چرن کو تھماتے ہوئے کہا۔

"یار تم تو اتنے پیسے لیتے ہو کہ رنڈی بھی مجرا کرنے کے نہ لیتی ہوگی۔"

کالی چرن نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی سے کہا۔

"جیناں بائی کو بلاؤ۔"

طے یہ ہوا کہ دل آرا تو جیل سے سرکاری طور پر جائے گی۔ کسی فرضی پروڈیوسر کی شوٹنگ پر۔ وہ تو نو بجے چلی جائے گی۔ دس بجے کے بعد جب پہرہ بدلے گا تو ایک کالی گاڑی جیل کے باہر میر چندانی حاجی عبدالسلام اور لاچی کا انتظار کرے گی۔ تین وارڈر ان تینوں کے ساتھ ہونگے، اور دو وارڈر دل آرا کے ساتھ صبح پانچ بجے یہ لوگ پہرہ بدلنے سے پہلے آجائیں گے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

دل آرا نے لاچی کو منا لیا تھا۔

اور لاچی اس لئے مان گئی تھی کہ اس نے آج تک کسی طوائف کا کوٹھا نہ دیکھا تھا۔

دل آرا، لاچی کو سمجھا بجھا کر رات کو نو بجے جیل سے رخصت ہوگئی۔ باہر سبز رنگ کی ایک گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دل آرا نے گاڑی آگے بڑھوا کے جیل کے غربی کونے پر رکوا دی۔ اور باقی لوگوں کا انتظار کرنے لگی۔

دس بجے کے قریب حاجی کی سیاہ کیڈی لک میں حاجی، میر چندانی، لاچی اور تین وارڈر لدے آ پہنچے۔

دل آرا نے سبز گاڑی چھوڑ دی۔

گاڑی میں جگہ نہ تھی۔ چھ آدمی اس میں پہلے سے لدے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اطمینان سے کیڈی لک کے اندر آ کر میر چندانی کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ دو وارڈر بھی تھے۔ اس لئے ایک وارڈر کو آگے بٹھا دیا گیا۔ اور دوسرے وارڈر کو جگہ دینے کیلئے دل آرا نے لاچی سے کہا۔ کہ وہ حاجی کی گود میں بیٹھ جائے۔

"ناں! میں نہیں بیٹھوں گی کسی کی گود میں۔"

لاچی غصے سے چلائی۔

"اری چند منٹ کی تو بات ہے۔" دل آرا نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "گاڑی میں جگہ کم ہے اس لئے کہہ رہی ہوں اور اپٹی کیٹ بھی یہی کہتا ہے۔"

"چولھے میں جائے تم لوگوں کا اپٹی کیٹ!"

لاچی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اس ڈھیل حاجی کی گود میں تو تمہارا وارڈر ہی بیٹھے گا۔"

جب لاچی کسی طرح نہ مانی تو وارڈر بیچارا بڑی تنگی سے گاڑی میں بیٹھ

گیا اور گاڑی دلدار روڈ کو روانہ ہوئی۔

۱۴

دلدار روڈ عجیب طرح کا بازار تھا۔ ایک طرف عورتوں کے کوٹھے تھے دوسری طرف لکڑیوں کے ٹال تھے اور پرانے زنگ آلود لوہے کے ٹکڑوں کی دکانیں، یہاں ہر طرح کی عورتیں اور ہر طرح کی لکڑیاں بیچی جاتی ہیں۔ لانبی، چھوٹی، سستی مہنگی ہر قسم کی لکڑی یہاں ملتی ہے۔ بانس کی، ببول کی، ساگوان کی اور شیشم کی لکڑیاں جنھیں دیمک چاٹ گئی تھی۔

عورتیں جنھیں جنسی بیماریوں نے کھالیا تھا۔
کھلے کواڑوں کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی گاہکوں کا انتظار کررہی تھیں۔

نالیاں پیشاب کی بُو اور شرابیوں کی ستے سے آئی ہوئی تھیں اور اُن پر چمبیلی کے پژمردہ پھول تیر رہے تھے اور فضا میں طبلے کی تال اور سارنگی کی لے پر جلی بھی ٹھمریاں اور سستے فلمی گانے مکھیوں کیطرح بھنک رہے تھے۔ اور ان سب کے اوپر تاریک گلیوں کا اندھیرا ایک گناہگار کہرے کیطرح چھایا ہوا تھا۔ یہ عورتیں انسان ہیں کہ لکڑی کی کھپچیاں۔ یہ دلال آدمی ہیں کہ لوہے کے زنگ آلود تر رے ؟

یہ زندگی کے جیتے جاگتے گیت ہیں کہ جہنم اور موت کے نوحے۔ یہ ایسی دنیا کا بازار ہے جسے زندہ انسانوں کی بستی کہا جائے یا گمشدہ روحوں کی وادی ؟

ایک لمحے کیلئے انسان یہ بھی بھول جاتا ہے کہ یہ ایسی دنیا ہے جہاں معصوم بچے ماؤں کی گود میں ہمکتے ہیں۔ جہاں ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے ہوئے سیندور کا ٹیکہ لگائے ہوئے پاکباز عورتیں تھالی میں کھانا پروس کر اپنے تھکے ہوئے شوہروں کے سامنے رکھتی ہیں اور ان کی نظریں فرطِ حیا سے جھک جھک جاتی ہیں۔

یکایک لاچی کو احساس ہوا جیسے ہر کوٹھے پر وہی گا رہی تھی

وہی ناچ رہی تھی۔ وہی بجی جا رہی تھی اور یہ صرف خالص مردوں کی تہذیب تھی۔ مردوں نے عورتوں کو چہار دیواری میں دھکیل دیا تھا۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ بلند و بالا، اونچے محلوں، ہوائی جہازوں اور راکٹوں کی تہذیب بنائی تھی۔ یہ چاند کے دل تک پہنچنے والے لوگ کیا کبھی عورت کے دل تک بھی پہنچ سکیں گے ؟

یکایک لاچی نے غصہ سے تھوک دیا، بولی۔

" مجھے واپس جیل لے چلو۔ "

" ابھی تو رات جوان ہے پیاری۔ "

حاجی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اس کے اندر وہسکی کے چار پیگ جا چکے تھے اور وہ بالکل اسیطرح محسوس کر رہا تھا جس طرح مرد چار پیگ پینے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ لاچی نے اپنی بانہہ اس سے چھڑانی چاہی، نرمی سے، احتیاط سے، شرافت سے اور تہذیب کے ساتھ! مگر حاجی نے اُسے زبردستی کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔

" لو پیو۔ ؟ "

لاچی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور پھر اُسے اس کے سر پہ انڈیل کر بولی۔

" سور کے بچے ! حرامی !! "

میر چندانی نے غصے میں آ کے لاچی کے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا۔ لاچی اِک دم غصے سے اٹھی۔ اور اس نے میر چندانی کو گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ اور جب حاجی اس کی مدد کو اٹھا تو اس نے پینترا بدل کر اُسے بھی چت کر لیا۔ اور پھر وہ دونوں کی چھاتی پر چڑھ کر دونوں کے سروں کو ایک دوسرے سے طبلے کیطرح بجانے لگی۔ اور زور زور سے چلانے لگی۔

" تاک دھنا دھن تھیّا ! "

" تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن !! "

" تاک ..... تاک ..... !!! "

میر چندانی اور حاجی چیخنے لگے۔

تھوڑی دیر میں بھگدڑ مچ گئی۔ لاچی اور وارڈر اور گاہک اور طبلچی اور سارنگی والے اور مہرسوں والے، اور خوشبودار عطر والے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اور سب کے بیچ میں لاچی ایک جھلائی ہوئی شیرنی کیطرح وار کر رہی تھی۔ اس کو مار، اُسکو پٹخ اس کو گرا، اس کے بال کھسوٹ، اس کا منہ نوچ کر ایک وحشیانہ خوشی سے چیخ رہی تھی۔ اور ناچ رہی تھی۔

"تاک دھنا دھن تھیا۔"

پولیس دھب دھب کرتی مختلف زینوں سے اندر آگئی۔ انسپکٹر، سب انسپکٹر، حوالدار اور سنتری، چند منٹ کے بعد سکون ہو گیا۔ پولیس نے سب کو گرفتار کر لیا۔

وارڈروں نے سنتریوں کے کانوں میں بہت کھسر پھسر کی مگر ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

حوالدار بولا۔

"جو کہنا ہے چوکی پر چل کر کہو۔"

جب سب لوگ حوالات میں بند کر دیئے گئے تو ایک وارڈر نے کہہ سن کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن کو ٹیلی فون پر بلایا ــ کالی چرن پسینے میں تر بتر دوڑا ہوا آیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اگر یہ معاملہ پولیس نے نہ دبا دیا تو وہ برخاست تو کیا ہو گا، شاید اُسے جیل بھی ہو جائے۔

انسپکٹر اور ڈپٹی جیلر منہ جوڑ کر بیٹھے اور کالی چرن نے حاجی اور میر چندانی سے ملاقات کی۔ پھر ہاتھ ایک جیب سے دوسری

جیب میں گئے۔ دوسری جیب سے تیسری جیب میں۔ جیب جا کے کہیں گلو خلاصی ہوئی۔ اور کیسے نہ ہوتی۔

میر چندانی اور حاجی کو معلوم تھا کہ اس دنیا میں جیب کی طاقت سے بڑی طاقت کوئی اور نہیں ہے۔

جب صبح پانچ بجے سے پہلے سے پہلے پہلے تفریح بازوں کی یہ ٹولی پھر سے جیل کے اندر پہنچ گئی۔ تب جا کے کالی چرن کو اطمینان ہوا۔ بال بال بچے، ورنہ آج نوکری ختم تھی۔

اگر کالی چرن کا بس چلتا تو اس واقعہ کے بعد لاچی کو جیل کے اندر ہی کڑی سے کڑی سزا دیتا۔ کیونکہ لاچی کی ہٹ سے ہی یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ اگر عین موقعے پر پولیس انسپکٹر اپنے افسر بھائی کی مدد کرنے راضی نہ ہو جاتا تو دوسرے ہی روز شور مچانیوالے اخبار، اور بات کا تبنگڑ بنانیوالے اخبار نویس یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوتے کہ آخر جیل کے قیدی پولیس کی حوالات میں کیسے پائے گئے۔ اُسے لاچی پر بیحد غصہ آ رہا تھا۔ کمینی خانہ بدوش دو ٹکے کی چھوکری جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹکٹکی پر بندھوا کر لاچی کی پیٹھ پر

بید لگائے اور عالمِ خیال میں اس نے ایسا کر ہی لیا اور وقتی طور پر اسکی مسرت سے اس نے لطف بھی اُٹھایا۔ مگر جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ لاچی کی تصویر خوب چند بنا رہا تھا۔ اس لئے لاچی کی رسائی سپرنٹنڈنٹ جیل تک تھی اور یہ بات بالکل صاف تھی کہ بیدزنی تو کجا، وہ ذرا سی بدسلوکی پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے سارا واقعہ کھول کر بیان کردے گی۔ اور لینے کے دینے پڑجائیں گے، یہی سوچ کر کالی چرن چپ رہا۔ اور اس نے لاچی سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی۔

جیناں بائی نے لاچی سے ضرور اتنا سمجھا دیا کہ وہ اس واقعہ کا خوب چند یا کسی سے بالکل ذکر نہ کرے ورنہ مجھے سخت سزا دیجائے گی۔ بڈھی جیناں کیخاطر لاچی نے خاموش رہنا منظور کرلیا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد دل آرا، اور لاچی کی کٹی ہوگئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنے کیلئے تیار نہ تھیں۔ اس میں کسی ذاتی دشمنی کو دخل نہ تھا۔ ان دونوں عورتوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کسی طرح کا حسد بھی نہ تھا۔ یہ لڑائی خیالات کی لڑائی تھی۔

دل آرا کا خیال تھا کہ لاچی ضرورت سے زیادہ اپنی عصمت کی اہمیت جتاتی ہے۔ اور سمجھتی ہے اس کا تعلق عورت کی روح اور اس کی پوری شخصیت سے ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہ عورت کی عصمت

تو عورت کے ہاتھ میں ایک طرح کا ہتھیار ہے۔ جو اُسے اپنی زندگی اور آسائش کیلئے مناسب موقعوں پر مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہیئے۔ اور اس میں کسی قسم کی جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔

جانے لاچی کے دل میں کیا خیال تھے۔ وہ پڑھی لکھی تو تھی نہیں کہ دل آرا کیطرح اپنے دل کی بات اندازِ بیان کے پردوں میں چھپا کر بیان کر سکتی۔ بس اُسے ایک ضد تھی۔ ایک جنون تھا جو اس کے سر پر سوار تھا۔ وہ تو صرف یہ کہتی تھی۔

"میں نہیں بکوں گی۔"

"کسی قیمت پر نہیں بکوں گی۔"

"اور یہ جو دل آرا ہے، جو دیکھنے میں اتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ بڑی آوارہ اور بدقماش عورت ہے۔ میں اِسے کبھی منہ نہ لگاؤنگی۔"

اگر آپ اسے کسی عقیدے کا نام دے سکتے ہیں تو یہی لاچی کا عقیدہ تھا مگر اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک سلجھی ہوئی معقولیت پسند دنیا ہے۔ جس میں آپ اور ہم رہتے ہیں۔ اس دنیا میں جب کوئی لاچی جیسی گمراہ روح آجاتی ہے تو ہم میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُسے راہِ راست پر لایا جائے

اپنے بھلے کیلئے نہیں، صرف اس کی اپنی بھلائی کیلئے، اس قسم کے غلط، احمقانہ غیر متوازی عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دے کر کوئی عورت ایک دن بھی اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

یہی سوچکر جبیاں بائی اور جیل کی دوسری عورتوں نے لاچی کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک وہ اپنی کوششوں میں لگی رہیں۔ حاجی عبدالسلام اور میر چندانی نے بھی اس کارِ خیر میں روپے پیسے سے ان کی مدد کی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں نے اس رات کے خوفناک واقعہ کے بعد یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جسطرح ہو سکے۔ لاچی کے غرور کو توڑ دینا چاہیئے اور اس کی شخصیت کو اور اس کے ذاتی حسن و جمال کے وقار کو کچل کر ایسا ہموار کر دینا چاہیئے کہ جیسے کولتار کی سڑک ہوتی ہے اس کام کیلئے حاجی اور میر چندانی نے جبیاں بائی کو ٹھیکہ دیا۔ کیونکہ اس مہذب و متمدن دنیا میں آج کل ہر کام ٹھیکے پر دیا جاتا ہے۔

دونوں بینکروں نے اس کام کیلئے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا وہ لوگ جو دل آرا کیلئے پندرہ بیس ہزار روپیہ خرچ کرنا اپنی تاجرانہ جبلت و ذہنیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اب تاؤ کھا کر پچاس ہزار تک دینے کو تیار ہو گئے۔ ان لوگوں کا غصہ بھی روپے کیصورت میں نکلتا ہے۔ یہ لوگ اگر دھرم اور ایمان پر آجائیں تو مندر اور مسجد بنانے کیلئے ہزاروں

خرچ کردیں۔ انتقام پر آجائیں تو ہزاروں خرچ کر کے مجھے اور آپ کو مروا ڈالیں۔ محبت کرنے پر آجائیں تو اپنی محبوبہ کو اشرفیوں میں تول دیں اور سونے میں لاد دیں۔ ایک غریب آدمی ان کے مقابلے میں محبت کرنے کی جرأت کہاں کر سکتا ہے۔ اور پھر لاچی ایسی بے یار و مددگار عورت کب تک سونے کی سڑک پر چلنے سے انکار کرے گی؟ یہ بھی دیکھنا ہے اس لئے بہت سوچ سمجھ کر پراجیکٹ منظور کیا گیا۔ "لاچی پراجیکٹ۔" اس کا تخمینہ پاس ہوا، ٹھیکہ دے دیا گیا۔ اور مزدور کام پر لگا دیئے گئے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

"میں نہیں بکوں گی، مر جاؤں گی مگر نہیں بکونگی۔"

یہی لاچی کا آخری فیصلہ تھا۔

جیناں نے سمجھایا

"پچاس ہزار کی رقم کوئی کم نہیں ہوتی، احمق نہ بنو۔ آفر قبول کر لو۔ اپنی زندگی بنا لو۔"

"اور گل سے دھوکا کروں؟"

"گل کو پتہ بھی نہ چلے گا۔"

"کیا دھوکا اسی کو کہتے ہیں جس کا پتہ چلے اور تمہارا کیا خیال ہے مجھے بھی پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے کس سے دھوکا کیا ہے؟"

" اس میں دھوکے کی کیا بات ہے ؟ یہ تو ایک وقتی بات ہوگی صرف جیل کی چار دیواری تک محدود رہے گی ۔ جب تم اپنی سزا بھگت کے جیل سے باہر نکلوگی تو اس پچاس ہزار کے سہارے نئی زندگی شروع کرسکوگی ۔ "

" اور گل سے کیا کہوں گی ؟ یہ روپیہ میں نے کہاں سے حاصل کیا ہے ؟ "

" چاہو تو کہہ دینا کہ میرے نام لاٹری نکلی ہے ۔ چاہو تو سچ سچ بتا دینا اور پھر دیکھ لینا ، گل کی آنکھیں ، تمہارے بے غرض محبوب کی آنکھیں بھی ان روپیوں کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ تمہاری زبان سے تمہاری بے وفائی کی داستان سن کر بھی تم سے سمجھوتہ کرلے گا ۔ "

" نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا ۔ "

" شرط ہو جائے ۔ "

" نہیں ، میں شرط لگانے کیلئے بھی تیار نہیں ہوں ۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھے گل پر بھروسہ نہیں ہے ۔ وہ تو ہے اور کبھی نہیں بدلے گا میرا گل ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھی میں جانتی ہوں لیکن میں کیوں ایک شرط کی خاطر ایسی غلط بات کروں ؟ "

" اس میں غلط بات کیا ہے ؟ تم اپنے جسم کی مالک ہو ۔ یہ

جسم تمہارا ہے کسی دوسرے کا تو ہے نہیں اور محبت تو بیکار سا خیال ہے
آنی جانی بات ہے۔ زندگی میں دس بار محبت ہوتی ہے بیس بار ٹوٹ
جاتی ہے۔ چالیس بار پھر ہو جاتی ہے۔ خود میں نے اپنی جوانی میں جانے
کتنی محبتیں کر ڈالیں۔ جب پہلی محبت ذرا پرانی اور بوسیدہ ہونے لگی۔
میں نے اس محبت کا دروازہ بند کر کے نئی محبت کا دروازہ کھول لیا۔"

"واہ!" لاچی غصے سے بولی۔ "عورت کی محبت نہ ہوئی میونسپلٹی
کی ٹونٹی ہو گئی۔ جب جی چاہا ٹونٹی گھما کے پانی پی لیا۔ جب جی چاہا ٹونٹی
گھما کے پانی بند کر دیا۔"

جیناں بائی لاجواب ہو کے چلی گئی۔

پلٹ پلٹ کر طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے
ہزار بار اس بات کو مختلف پیرایوں سے لاچی کے سامنے پیش کیا۔
مگر لاچی کا ایک ہی جواب تھا۔ اس میں اس کی ضد کو دخل نہ تھا۔ لاچی
کا جواب گویا اس کے جسم اور روح کی پوری شخصیت کا جواب تھا۔
وہ کوئی دوسرا جواب دے ہی نہ سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ عقلی اعتبار سے
لاجواب ہو جاتی، قائل بھی ہو جاتی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں غم و غصے
احتجاج اور نفرت کا ایک ریلا سا لاوے کی طرح اُبلتا ہوا اس کے رگ
و ریشے میں سما جاتا اور وہ غصے سے پاؤں پٹک کر کہتی۔

"نہیں نہیں جو مجھے میری مرضی کے خلاف چھوئے گا۔ میں اُسے کچا چبا جاؤں گی۔"

کچا تو خیر وہ کیا چباتی، جیل میں ایک سے ایک بڑا گھاگ رہتا تھا۔ جو لاچی کی گردن پر چھری رکھ کر اس کا غرور توڑ سکتا تھا۔ مگر کم بخت خوبچند کی وجہ سے سب اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے ہوتے ہوئے لاچی کو کسی جال میں نہیں پھنسایا جا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا تھا وہ کیا جا رہا تھا۔

لاچی کو جیل میں عجیب عجیب تجربے ہو رہے تھے۔ ایک روز اس کی ملاقات گنگا بائی سے ہوئی۔ جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ کم بخت کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ اس پر دو درجن چوریوں کا الزام تھا۔

"کیا تم مرغیاں چراتی تھیں؟"

لاچی نے اس سے پوچھا۔

گنگا کے منہ سے ہنسی کا فوارہ اُبل کر بکھر گیا۔ اس کی چاندی جیسی ہنسی کی لہریں دُور دُور تک فضا میں پھیل گئیں۔

بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

" نہیں، میں کپڑے چراتی تھی۔ "

" کیسے ؟ "

" میرے ساتھ دو مرد بھی کام کرتے تھے۔ ہم تینوں کی ایک ٹولی تھی۔ ہم لوگ آدھی رات کے وقت بڑی بڑی دکانوں کے شوکیس کا کانچ بڑی احتیاط سے توڑ ڈالتے۔ پھر اس میں گھس کر چوری کرتے وہ دونوں مرد باہر رہتے۔ میں اندر جاکر پلاسٹک کے ماڈلوں کے جسم سے ساڑیاں اتار لیتی۔ اور دوسرے تھان بھی جو شوکیس میں سجے ہوتے نکال نکال کر باہر پھینکتی۔ "

" اگر کوئی پولیس والا آجاتا ؟ "

" تو دونوں مرد اِدھر اُدھر بھاگ جاتے۔ اور میں شوکیس میں کھڑی ہوکر بالکل ایک ماڈل کی طرح بن جاتی اور پولیس والے مجھے بھی ایک پلاسٹک کا ماڈل سمجھ کر آگے چلے جاتے تھے۔ "

اب کے لاچی خوب ہنسی۔

اسے یہ ترکیب بہت پسند آئی۔

" بہت عمدہ، بہت اچھی ترکیب ہے۔ بہت کم کسی کو سوجھی ہوگی۔ "

" ہاں، مگر پولیس والوں نے آخر ہمیں بھی پکڑ ہی لیا۔ "

" تم جیل سے باہر جاکر کیا کام کروگی ؟ "

"پھر یہی کام شروع کرونگی۔ "

" پھر سزا پانے کا فائدہ کیا ہوا ؟ "

" سزا تو جرم کیلئے ایک وقفہ ہے۔ "

گنگا نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

" اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ "

" تم نے شادی نہیں کی ؟ " لاچی نے پوچھا۔

" جن دو مردوں کیساتھ میں کام کرتی ہوں ان دونوں کے ساتھ میں نے تقریباً شادی کر رکھی ہے۔ "

" دونوں کیساتھ ؟ "

لاچی حیرت سے بولی۔

" ہاں دونوں کیساتھ۔! "

گنگا نے کسی قدر افسردگی کیساتھ کہا۔

تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ اور اب اس کا چہرہ پھر بشاش ہوگیا۔

" مگر وہ دونوں مجھے بہت خوش رکھتے ہیں۔ "

لاچی کے دل میں ایک لمحہ کیلئے خیال آیا کہ وہ بھی جیل سے نکل کر کچھ عرصے کیلئے اس پیشے کو اختیار کرلے۔ ایک لمحے کیلئے اس

کے دل میں اس طرح کی چوری کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ اس طرح کا خطرہ مول لینا اُسے بہت پسند آیا۔ مگر دو مردوں والی بات اُسے پسند نہ آئی۔ آخر جب وہ دو مردوں کیساتھ برابر ان کے خطرے کی حصہ دار ہوتی ہے۔ برابر کام کرتی ہے تو اس سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ چوری کے علاوہ، وہ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دے۔ یہ تو دھاندلی ہے۔ برابر کی ساجھے داری نہیں ہے۔

لاچی کو کوشلیا بھی بہت عجیب معلوم ہوئی۔ کوشلیا کے کئی نام تھے، اقبال بانو، میری ڈلیسوزا، سُرجیت کور اور جانے کیا الا بلا۔ وہ گریجویٹ لڑکی تھی۔ انگریزی کے علاوہ اردو، ہندی، پنجابی، مراٹھی، بنگالی، فرنچ، تامل، ملیالم زبانوں میں بھی شُدبُد رکھتی تھی۔ بڑی اَپ ٹو ڈیٹ اور فیشن ایبل لڑکی تھی۔

گرفتار ہونے سے پہلے اس کا دھندا یہ تھا کہ وہ بیکار نوجوانوں کو نوکری کا لالچ دیکر اور مختلف منسٹروں اور آفیسروں سے اپنا رسوخ ظاہر کر کے ان سے روپیہ اینٹھتی تھی۔ اور روپیہ لے کر رفو چکر ہو جاتی تھی۔ آج تک وہ دو تین سو نوجوان لڑکیوں کو دھوکہ دے کر اس طرح ان سے ہزاروں روپیہ حاصل کر چکی تھی۔

لاچی نے پوچھا۔ • مگر تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ کہیں بھی

ملازمت کر کے دو تین سو روپے باعزت طریقے سے کما سکتی ہو۔"

"دو تین سو روپے میں میرا خرچ پورا نہیں ہوتا۔"

"تو خرچ کم کر دو۔"

"خرچ کم نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"میں اچھی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھی زندگی کیا ہوتی ہے؟"

"اچھی زندگی، اچھے زیوروں اور بہت سے روپے سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

"روپیہ! روپیہ!! روپیہ!!! کیا دنیا میں خوشی صرف روپے سے حاصل کی جا سکتی ہے؟"

"خوشی تو اس دنیا میں عورت کو کہاں ملتی ہے؟" کوشلیا غصے سے بولی۔ "میرے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں آکر مجھے ایک بڈھے کے گلے سے باندھ دیا۔ جب وہ بڈھا مر گیا۔ تو اس کی پہلی بیوی اور بچوں نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا۔ جب انہوں نے مجھ سے دھوکہ کیا تو میں غیروں سے دھوکہ کر کے کون سا اتنا بڑا پاپ کر رہی ہوں۔ میں نے تو لاکھ چاہا کہ کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی

کرلے۔ تاکہ میں مذہبی اور قانونی اعتبار سے خود کو اس کے ہاتھ بیچ کر آرام وسکون کی زندگی گزاروں۔ مگر کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی کرنے کیلئے تیار نہ ہوا۔

"تو گویا تم شادی میں بھی بیچنے کی بات کرتی ہو۔"

"شادی میں بھی عورت ایک طرح سے اپنا جسم بیچتی ہے اور کیا کرتی ہے؟"

"محبت کوئی چیز نہیں؟"

"ہوتی ہوگی۔" کوشلیا بڑی تلخی سے بولی۔ "مجھے تو نہیں ملی۔"

لاچی نے سوچ سوچ کر کہا۔

"میں تو سمجھتی ہوں تم اتنی اچھی ہو کہ ہر شریف آدمی تم سے شادی کرنے کیلئے تیار ہو جائے گا۔ اگر تم اُسے اپنی فریب کاری کی باتیں نہ بتاؤ۔"

"میں جس شریف آدمی سے شادی کا خیال کروں اُسے کیسے نہ بتاؤں؟ اُسے تو سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ میں ہر بار جیل سے چھوٹ کر تہیہ کرتی ہوں کہ اب کے سیدھے راستے پر چل کر کسی شریف آدمی سے شادی کرلوں گی اور جب کسی شریف آدمی کو اپنی کہانی سناتی ہوں تو وہ بدک جاتا ہے۔"

"شریف آدمی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

لاچی نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسا آدمی جس کی آمدنی کم از کم ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہو۔"

"ارے!" بے اختیار لاچی کے منہ سے نکلا۔

"تب تو واقعی کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

کوشلیا عرف اقبال بانو عرف سرجیت کور نے اپنے بریدہ گیسوؤں کو ایک ادائے خاص سے جھٹکا دیا۔ جیسے اسے دنیا میں کسی کی پرواہ نہیں۔ پھر اس نے مردوں کو ایک موٹی سی غلیظ گالی دی اور لاچی سے منہ موڑ کر اپنی بارک کو چل دی۔

اس دن لاچی کے خیالات میں عجیب اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنا گھاگرا پہنے، ہاتھ پر دَف اُٹھائے۔ خوب چند کے سامنے اسٹول پر کھڑی ہو گئی تو آج اس کے چہرے پر وہ روز کی سی بشاشت نہیں تھی۔ آج اس کا چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوب چند تصویر بنانے میں منہمک تھا۔

یکایک لاچی نے پوچھا

"سپری ٹمان؟"

"ہاں لاچی!"

"اگر روپے سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو ایک روپے سے

بھی ہو سکتی ہے اور ایک ہزار سے بھی ؟ "

" ہاں لاچی ! "

لاچی تھوڑی دیر چپ رہی - پھر بولی .

" پُسری ٹان ! "

" ہاں لاچی ! "

" کیا تم شریف آدمی ہو ؟ "

" کیا مطلب ؟ "

" یعنی تمہاری تنخواہ کتنی ہے ؟ "

" چھ سو روپے ! "

" تب تم شریف آدمی نہیں ہو . "

خوب چند کا موقلم رُک گیا - وہ لاچی کیطرف دیکھ کر بولا " ایسا کیوں سوچتی ہو تم - میں نے تم سے کبھی کوئی گستاخی کی ؟ "

" نہیں - مگر کوشلیا کہتی ہے کہ شریف آدمی وہ ہوتا ہے جس کی تنخواہ کم از کم ایک ہزار روپیہ ہو - "

خوب چند ہنسا - بولا

" جو بات کوشلیا کہتی ہے وہی بات دنیا بھی کہتی ہے اور اسی لئے اس دنیا میں فریب کاری ہوتی ہے - "

لاچی سوچ سوچ کر پھر بولی۔

"سپری ٹان!"

"ہاں لاچی!"

"تو کیا جو آدمی ایک ہزار کماتا ہے وہ دھوکا نہیں کرتا؟"

"نہیں کرتا تو ہے۔ بلکہ ایک ہزار پانیوالا اور زیادہ دھوکا کرتا ہے۔"

"پھر شرافت کیا ہوتی ہے؟"

"تم نے بہت مشکل سوال پوچھا ہے لاچی!" خوب چند نے لاچی کے قریب جاکر کہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر کہا۔

"تمہارے سوال کا جواب اس خط میں ہے۔"

"یہ خط گل کا ہے؟"

"لاچی زور سے چلائی۔"

"ہاں۔"

لاچی چھلانگ مار کر اسٹول سے نیچے آگئی۔ وہ خط لینے کیلئے بچوں کی طرح بیقرار ہوکر خوب چند کے پاس دوڑی۔ خوبچند بچوں کیطرح اس سے دور بھاگنے لگا۔ آخر لاچی نے اُسے پکڑ

لیا۔ اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس نے اپنا خط چھین لیا۔ پھر اس نے خوب چند کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اس اسٹول پر بٹھا دیا جس پر وہ بیٹھی تھی اور وہ خود ایزل کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور برش اُٹھا کر اس نے تہدیدی انداز سے اسے جھُلاتے ہوئے کہا۔

" ابھی گل کا خط مجھے سناؤ ورنہ میں اس برش سے تمہارے سارے رنگوں پہ پانی پھیر دونگی ۔ "

" ارے رے، ایسا مت کرنا۔ میں تمہیں ابھی خط سناتا ہوں ۔ ! "

خوب چند نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور خط سنانے لگا۔ لاچی دوڑ کر اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی ٹھوڑی خوب چند کے گھٹنے پر رکھ لی۔ اور خط سننے لگی۔

خوب چند بولا۔

" جان سے پیاری لاچی ! "

لاچی نے خوب چند کو مارنے کیلئے ایک دم ہاتھ اُٹھایا۔ خوبچند نے اس کا وار روکتے ہوئے کہا۔

" ارے پگلی ! یہ میں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو گل کا خط تمہیں

پڑھ کر سنا رہا ہوں۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے مگر دیکھو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنانا۔ اپنی طرف سے کچھ جوڑنا نہیں، ورنہ۔۔۔۔۔"

خوب چند سنانے لگا۔

"میرا دل میں ہر دم تمہارا تصور رہتا ہے۔ ہر وقت تمہاری تصویر میری آنکھوں میں سمائی رہتی ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اپنی لاچی کی پیاری پیاری صورت مجھے یاد نہ آتی ہو۔ اوّل سے آخر تک، زندگی سے موت تک، جب تک میں زندہ ہوں اپنی لاچی سے محبت کرتا رہوں گا۔۔۔۔"

لاچی آنکھیں بند کر کے سنتی گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ معمولی لفظ نہیں ہیں، شہد کے گھونٹ ہیں، جو اس کی روح میں اترتے جا رہے ہیں، نرم ملائم ریشم کے شہپر ہیں۔ جن کے سہارے وہ کائنات کے خلاؤں میں اُڑی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔

"گل۔۔۔۔گل۔۔۔۔گل۔۔۔۔میرے پھول۔۔۔۔!!"

دوسرے ماہ گل لاچی سے ملنے کیلئے آیا۔

لاچی گل کا ہاتھ پکڑ کر خوب چند کے پرائیویٹ کمرے میں لے گئی۔ اور بڑے فخر سے اُسے خوب چند کو دکھا کر بولی۔

"یہ میرا گل ہے!"

خوب چند نے گل کو سر سے پاؤں تک یعنی چپل سے پشاوری کلاہ تک دیکھا۔ لانبا بانکا وجیہہ بھر پرا گل ..... مردانہ وقار اور حسن کی زندہ تصویر۔

خوب چند نے ایک لمحے کیلئے دل ہی دل میں اپنا اس سے

مقابلہ کیا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک پھیکی کھسیانی سی روتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے گل سے کہا۔

" آؤ آؤ۔ یہاں بیٹھو ! "

لاچی بولی۔

" اور یہ میرا اسپرٹان ہے ..... بہت اچھا آدمی ہے۔ اس کی مہربانی سے ہم لوگ یہاں مل رہے ہیں۔ ورنہ لوہے کی جالی والے کمرے میں ملتے۔ "

گل نے تشکر آمیز نگاہوں سے خوب چند کیطرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے ہاتھوں کی بے چینی البتہ کہہ رہی تھی کہ گل بیحد مضطرب ہے۔

خوب چند نے جب گل کی خاموشی دیکھی اور اس کی انگلیوں کا اضطراب؛ تو اس نے برش کو آہستہ سے پانی کے چھوٹے سے پیالے میں دھیرے دھیرے دھویا۔ پھر آنکھیں جھکائے آہستہ سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

خوب چند کے جاتے ہی لاچی بے اختیار ہو کر گل سے لپٹ گئی۔ اس نے اس کا وہ پشاوری کلاہ جس پر لنگی بندھی ہوئی تھی اتار کر الگ رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو پہلے اپنے ہاتھوں میں لیکر

پھر اسے اپنے گالوں سے لگا کر گلوگیر آواز میں بولی۔

"گل، گل! تم پچھلے ماہ مجھ سے ملنے کیلئے نہیں آئے، کیوں؟"

گل چپ رہا۔ وہ اپنے بے چین ہاتھوں کو کبھی کھولتا، کبھی بند کرتا۔ اس کے سینے سے لگی لاچی اس کے دل کی دھڑکن سن رہی تھی۔ ہولے ہولے گل کا ہاتھ لاچی کی کمر پر گیا۔ اس نے ایکدم اسے بھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ پھر ایک دم چھوڑ دیا۔ اور سر جھکا کر لاچی سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

"گل! کیا بات ہے؟" لاچی ایک دم گل کے قریب آ گئی اور گل کا منہ اپنی طرف پھیرتے ہوئے بولی۔ "کیا بات ہے؟ بتاؤ گے نہیں؟"

گل نے آہستہ سے کہا۔ "میری درخواست نامنظور ہو گئی ہے۔"

"کون سی درخواست؟"

"ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست۔"

لاچی یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"نامنظور ہو گئی تو کیا ہوا، اس میں اتنا منہ لٹکا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کو دیکھو، ہم تو کہیں کے شہری

نہیں ہوتے، جہاں جی چاہتا ہے، چلے جاتے ہیں۔"

"تمہاری بات اور ہے۔ میں پٹھان ہوں۔ پاکستان کے ملک کا رہنے والا ہوں۔"

"ملک کیا ہوتا ہے؟" لاچی نے پوچھا۔

"ملک؟" گل بولتے بولتے رُک گیا۔ تھوڑی دیر کیلئے اس نے بھی اپنے آپ سے پوچھا۔۔۔۔ واقعی ملک کیا ہوتا ہے؟ اور جب اسے اس کا کوئی معقول جواب نہ سوجھا تو اس نے رُکتے رکتے کہا۔ "ملک تو ملک ہوتا ہے، جیسے ایک ملک پاکستان ہے ایک ملک ہندوستان ہے، ایک ملک چین ہے، ایک ملک جاپان ہے۔ یہ سب ملک ساری دھرتی کے الگ الگ حصے ہیں۔"

"مگر ہم خانہ بدوشوں کیلئے تو یہ ساری دھرتی ایک ہے۔"

"مگر اس دنیا کے انسانوں کیلئے ایک نہیں ہے۔" گل نے ذرا تلخی سے کہا۔ "انھوں نے جو اپنے آپ کو انسان، مہذب اور ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ اس دھرتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور اُسے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے یہ تیرا، وہ میرا، وہ اس کا۔"

"لیکن تم تو میرے ہو!" لاچی نے اپنے دونوں بازوؤں

سے گل کے گرد بڑی محبت سے گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ تم تو صرف میرے ہو۔ مجھے کسی کے ملک سے کیا لینا دینا ہے۔ میں تو ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں مجھے اِن بڑی بڑی باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اگر تمہاری درخواست انھوں نے نامنظور کردی ہے۔ تو کیا ہوا۔ اللہ میاں نے ہم دونوں کی محبت کی درخواست تو نامنظور نہیں کی ہے۔"

"اب تمہیں کیسے بتاؤں لاچی۔" گل نے بیحد مضطرب ہو کر کہا۔ "اس درخواست کے نامنظور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب میں ہندوستان میں نہیں رہ سکوں گا۔ تم سے ہر ماہ ملنے کیلئے نہیں آیا کروں گا۔ جب تم قید وبند کی سختیاں جھیل کر اس جیل خانے سے باہر نکلو گی تو میری صورت نہ دیکھ سکو گی۔"

"نہیں نہیں۔" یکایک لاچی چیخی۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کوئی میرے گل کو مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

لاچی نے اپنے بازوؤں کو اور بھی گل کے گرد کس دیا۔ اور بالکل اس سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو، ڈبڈبا آئے۔

اس نے گل سے کہا

"نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے پریشان کرنے

کیلئے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو۔ تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو کہہ دو نا گل!
یہ سب کچھ مذاق ہے۔"

گل سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بہت دیر کے بعد
جب اس نے سر اٹھایا تو لاچی نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو
جھلک رہے تھے۔

"ہم لوگ سود خور پٹھان تھے۔ برسوں سے اس ملک میں
یہی دھندا کرتے تھے۔ جب کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میرے باپ نے
کبھی ہندوستان کا شہری بننے کیلئے نہیں سوچا، نہ میں نے۔ ہم لوگ
سال دو سال بعد اپنے وطن جاتے تھے اور وہاں چند ماہ رہ کر پھر واپس
آجاتے تھے۔ ہمارا روزگار یہاں تھا۔ وطن دوسرا تھا۔ مگر اب بہت کچھ
بدل گیا ہے۔ پہلے یہ ایک ملک تھا۔ اب اس کے دو ملک ہو گئے
ہیں۔ اب پاکستان ایک الگ اور آزاد ملک ہے، ہندوستان دوسرا
ملک ہے۔ الگ اور اپنی جگہ پر آزاد، قانون بھی بدل گئے ہیں۔ سود خوری
پر پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔ میرے باپ کا دھندا مندے میں چلا گیا
ہے۔ وہ تو پاکستان جا رہا ہے۔ اس نے تو کبھی ہندوستان کا شہری
بننے کیلئے نہیں سوچا۔ میں نے بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا
تھا۔ مگر پہلے تم نہ تھیں۔ اس لئے میں کیوں ایسا سوچتا جب میرے

دل میں تمہاری محبت آئی تو میں نے یہاں رہنے کا سوچا۔ میں نے ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست دی۔ مگر جب یوں سوچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے میری درخواست نامنظور کر دی۔ اب وہ مجھے یہاں رہنے نہ دیں گے۔"

"تم نے ان سے کہا ہوتا۔ میری لاچی یہاں ہے۔ میں یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں۔"

"وہ لوگ محبت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف نفرت کو سمجھتے ہیں۔"

"تم نے کہا ہوتا۔ یہ ساری دھرتی خدا کی ہے۔"

"یوں تو اس دنیا میں مندر اور مسجد اور گرجا بہت سے ہیں مگر سچ پوچھو تو زمین کا ایک چپہ خدا کا نہیں ہے۔"

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ میں تمہیں نہیں جانے دونگی۔"

لاچی یکایک بڑی مضبوطی سے بولی مگر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے بازو گل سے ہٹا لئے اور اپنے چہرے کو ان میں چھپا لیا اور سسکیاں لے لیکر رونے لگی۔

"کیوں روتی ہے لاچی! جانے کب سے، آج سے نہیں، شاید سینکڑوں ہزاروں سال سے، روزِ ازل سے، تخلیق آدم سے انسانیت اسی طرح رو رہی ہے اور محبت اسی طرح بین کر

رہی ہے۔ نام تو بہت لیتے ہیں لوگ انسانیت کا، محبت کا، اور خوبصورتی کا۔ اور بھائی چارے کا۔ حسن کا اور پاکیزگی کا۔ سیاست دانوں نے ان قدروں کے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر، ادیبوں نے کتابیں لکھ لکھ کر، فلاسفروں نے زندگیاں اسی سوچ میں گھلا کر انسانیت محبت اور بھائی چارے کی داد دی ہے۔ مگر کس نے اس محبت کے آنسو پونچھے ہیں، کس نے انسانیت کو سہارا دیا ہے، کس نے پاکیزگی کی عزت کی ہے۔ کس نے حسن کو شائستگی بخشی ہے۔ یہ سب لوگ محبت کی آڑ میں نفرت، انسانیت کے روپ میں درندگی، خوبصورتی کے پردے میں بدصورتی اور پاکیزگی کے جھروکے میں گندگی پھیلا پھیلا کر اپنی بلند و بالا تہذیب کا جھنڈا اونچا کرتے ہیں۔ تہذیب! ان انسانوں سے زیادہ تو دریائی گھوڑوں میں پائی جاتی ہے۔"

گل نے آہستہ سے کہا۔ "سات دنوں کے اندر اندر مجھے یہاں سے چلا جانا ہوگا۔"

لاچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گل نے لاچی کے آنسو پونچھے۔ اس نے صرف اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے جھٹک دیئے۔ اس کا نچلا جبڑا تن گیا۔ اس نے بڑی سختی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں

"اچھا لاچی میں جاتا ہوں۔"

لاچی نے اس کے بازو پکڑ لیئے۔

"مت جاؤ میرے گل! مت جاؤ، کہیں مت جاؤ۔"

گل نے بڑی سختی سے ایک قدم اُٹھایا۔ دوسرا قدم، تیسرا قدم، لاچی اس کے پاؤں کیساتھ روتی اور گھسٹتی چلی آئی۔

"مت جاؤ میرے گل، مت جاؤ۔"

لاچی رو رو کر بولی۔

آخری بار کوشش کر کے گل نے لاچی کی گرفت سے اپنا پاؤں آزاد کر لیا۔ اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لاچی وہیں زمین پر پڑی پڑی روتی رہی۔

بہت دیر کے بعد خوب چند اندر آیا اور اس نے لاچی کو زمین سے اُٹھایا۔ اس کے آنسو پونچھے اور اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا اور پوچھا۔

"گل چلا گیا؟"

"ہاں!" لاچی رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔ "اور اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

خوب چند اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"گل نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے مگر اس میں اس بیچارے کا کیا قصور ہے؟ قصور تو حالات کا ہے اور اس زمانے کا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو لاچی۔ گل چلا گیا تو کیا ہوا؟ میں جو موجود ہوں میں تمہاری دیکھ بھال کروں گا۔ تمہیں جیل میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اور جب تم جیل کاٹ کر آزاد ہو جاؤ گی تو میں اس جیل کی نوکری سے استعفیٰ دیدونگا۔ اور تم سے شادی کر لوں گا اور تمہیں پیرس لے چلوں گا اور دنیا کو وہ شاہکار دکھادوں گا جو میری تصویر ہوگی اور دنیا کو وہ شاہکار بھی دکھاؤں گا جس کے حسن سے متاثر ہو کر میں نے اس کی تخلیق کی ہے۔"

یکایک لاچی نے اپنا جھکا ہوا سر خوب چند کے کندھے سے اُٹھالیا۔ اس کا ڈھیلا بدن یکایک ایک کمان کیطرح تن گیا۔ وہ یکایک خوب چند سے الگ ہو کے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور شعلہ بار نگاہوں سے خوب چند کیطرف دیکھ کر بولی۔

"میری بات!"

"ہاں لاچی!"

"کیا تم مجھے کسی طرح عمر بھر کی قید نہیں دے سکتے؟"

"نہیں لاچی! جس کا جتنا جرم ہوتا ہے اُسے اتنی ہی سزا ملتی ہے۔"

"تو پھر مجھے کسطرح عمر قید ہو سکتی ہے ؟"

"اگر تم دوسری بار کسی انسان کو قتل کرو ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو میں پھر جیل سے چھوٹ کر قتل کرونگی پھر قتل کروں گی۔ پھر قتل کرونگی اور اس وقت تک انسانوں کو قتل کرتی رہوں گی۔ جب تک تم مجھے عمر قید کی سزا نہ دو یا پھانسی پر نہ چڑھا دو۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو لاچی ؟"

"اس لئے کہ تم سب قتل کر دینے کے لائق ہو۔"

پھر وہ وہاں سے اٹھی اور ایزل پر رکھی ہوئی اپنی نامکمل تصویر کیطرف بڑھی، ہاتھ بڑھا کر اس نے تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"تم عورت کی تصویر بنانے کا کیا حق رکھتے ہو؟ کبھی تم نے اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ تم سب لوگ اس کے ارد گرد لوہے کی سلاخیں کھڑی کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تم لاچی کو نہیں جانتے۔ میں ایک آزاد خانہ بدوش لڑکی ہوں۔ میرے لئے کوئی ملک نہیں ہے، کوئی قوم نہیں ہے اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ میں ہر دیوار پھلانگ جاؤں گی اور ہر سلاخ توڑ ڈالوں گی، میں چوری کروں گی، جیب کتروں گی، قتل کروں گی، ڈاکے ڈالوں گی۔

لیکن کبھی کوئی گل کے سوا میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔"

لاچی نے گویا عرش کی بلندیوں سے زمین پر بیٹھے ہوئے حقیر خوب چند کو دیکھا اور پھر شاہانہ وقار سے قدم اٹھاتی ہوئی اسطرح دھیرے دھیرے کمرے سے نکلی، جیسے اس نے انجیل کی آخری آیت آسمان سے زمین پر اتار دی ہو۔ اور اپنا کام ختم کر کے تختۂ دار کی طرف بڑھ رہی ہو۔

اور خوب چند نے سوچا

" لاچی ؟ کیا کاغذی تصویر پھاڑ دینے سے ذہن کی تصویر بھی پھاڑی جا سکتی ہے، بیوقوف دلرُبا! تیری تصویر تو میں اب آنکھ بند کر کے بھی بنا سکتا ہوں۔"

مگر اس نے لاچی سے کچھ کہا نہیں۔

خاموشی سے تصویر کے ٹکڑے ہوتے دیکھتا رہا۔۔

خوب چند نے پھر بڑی محنت اور کاوش سے لاچی کی تصویر بنائی۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو لاچی نے اُسے دیکھ کر کہا۔

"یہ جھوٹی تصویر ہے۔"

"کیا جھوٹی ہے؟"

خوب چند نے لاچی سے پوچھا۔

"میں اتنی خوبصورت نہیں ہوں جتنی یہ تصویر ہے۔" لاچی نے تصویر کی طرف دیکھ کر اعتراف کیا۔ "یہ لباس میرا ہے۔ یہ صورت بھی میری ہے، رنگت اور قد اور شکل سب بالکل ویسی ہی ہے

جیسی میں ہوں تاہم میری تصویر ہوتے بھی میری نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے سُپری ٹان ؟"

لاچی نے تصویر کیطرف سے مڑکر خوب چند سے پوچھا

خوب چند کا رنگ فق ہوگیا۔ آخر وہ لمحہ آ پہنچا جس کا اُسے انتظار تھا۔ وہ کہے یا نہ کہے اس نے اس تصویر کے خدوخال ہولے ہولے ابھارتے ہوئے کئی بار سوچا تھا، کہہ ڈالے، پھر سوچا تھا، کیوں کہے ؟ آخر خاموشی کی بھی تو ایک زبان ہوتی ہے اور نگاہ بھی تو گویا ہوتی ہے اور کانپتی ہوئی انگلیوں کی پور پور سے یہ کیسا نغمہ پھوٹتا ہے۔ کیا یہ کسی کو سنائی نہیں دیتا۔

میں نے تو تیری تصویر کے ذریعہ تجھ سے بہت کچھ کہا ہے لاچی! پھر تو سنتی کیوں نہیں، کیا تو صرف اس میں اپنی شخصیت دیکھتی ہے اپنی صورت کا عکس، اپنے حسن کے خدوخال، لیکن میری روح کا جمال تجھ سے کیوں پوشیدہ ہے۔ یہ میرے ترسے ہوئے برش کے رنگ انھوں نے تری تصویر میں کتنی نادیدہ حسرتوں کے رنگ برنگے گلزار کھلا دیئے ہیں۔ اری تو کیسی لڑکی ہے ؟ میرے دل کا لہو بھی نہیں دیکھ سکتی ؟ اب میں تجھ سے کیا کہوں ؟

خوب چند خاموش نگاہوں سے لاچی کی تصویر کیطرف

دیکھتا رہا۔ اور کچھ نہ بولا۔

اس نے لاچی کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ اس کے منہ سے ایک آہ تک نہ نکلی۔ اس کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا۔ بس وہ خاموشی سے مٹھیاں بھینچے، سختی سے ہونٹ بند کئے تصویر کے سامنے چپ چاپ کھڑا رہا۔

لاچی یکایک اس کے پاس آگئی۔ اس نے خوب چند کے کندھے پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بہت سے مدھم اور میٹھی آواز میں بولی۔

" اگر میں گل سے پیار نہ کرتی تو تری ہو جاتی سپری ٹماٹ! "

خوبچند یکبارگی چونکا۔ پھر اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں تن گئیں۔ اس کا سارا جسم طوفان میں لرزنے والے پتے کیطرح کانپا اور کانپ کر یکایک ساکت ہو گیا۔ گویا پتہ ڈال سے گر گیا اور ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا کہیں دور فضا میں کھو گیا۔ موت کی وادیوں میں ہمیشہ کیلئے کھو گیا۔

" مگر گل تو چلا گیا ہے، ہمیشہ کیلئے، وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ " خوبچند نے لاچی کیطرف مڑے بغیر کہا۔ جیسے وہ لاچی سے نہیں تصویر سے پوچھ رہا ہو۔

" وہ نہ آئے گا تو کیا ہوا، میں تو اس کے پاس جا سکتی ہوں میں تو خانہ بدوش ہوں سُپری ٹان! میرے لئے تو کوئی مکان نہیں ہے کوئی دیس نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں ہے اور کوئی جیل نہیں ہے۔ میں تو ہر کہیں جا سکتی ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں میں تو خود اکیلی پیدل چل کے بھی گل کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ چاہے وہ یہاں سے ہزاروں میل دور کیوں نہ رہتا ہو۔"

"میں نے سوچا تھا!" خوب چند نے کہا اور پھر رُک گیا۔

"کیا سوچا تھا؟"

"سوچا تھا یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ تمہیں لے کر پیرس چلا جاؤں گا۔ اور وہاں ایک اسٹوڈیو کھول کر صرف تمہاری تصویریں بنایا کروں گا۔"

"صرف میری کیوں۔؟"

"کبھی کبھی ایک شخصیت ایک سمندر کے برابر ہو جاتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔!" لاچی نے حیران ہو کر پوچھا۔

خوب چند اس کی طرف مڑا۔ بولا۔ "یہ تو نہیں ہے کہ تم نے کچھ سنا ہو اور کچھ سمجھا نہ ہو۔ آخر میرے نہ کہنے پر جب تم نے اتنا کچھ سمجھ لیا تو اتنی سی بات بھی کیوں نہ سمجھ سکو گی۔ اور اگر خود ہی

نہ سمجھو تو میرے کہنے سے کیسے سمجھ سکو گی ؟"

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ روح کی بات روح سمجھ لیتی ہے لیکن کوئی روح دوسری روح میں اتنی ڈوب نہیں سکتی کہ اس کے غم کو اپنا غم بنا لے ہائے کتنی بڑی تنہائی ہے ! "

لاچی نے کہا۔

" تم ہمیشہ یا تو کچھ ثابت کرتے رہتے ہو یا تصویر بناتے رہتے ہو اور میں صرف چاہتی ہوں۔ سپُری ٹان ! کیا صرف چاہنا کافی نہیں ہے۔ "

خوب چند نے لاچی کیطرف ایک قدم بڑھایا بے اختیار اس کا جی چاہا تھا کہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ رُک گیا۔ اس نے اپنے بازو بڑی سختی سے اپنے سینے کے گرد لپیٹ لئے اور بولا۔

" کبھی کبھی چاہنا تو کیا کسی کیلئے مر جانا بھی ناکافی ہوتا ہے "۔

" ہائے تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ ! "

لاچی نے تعریفی نگاہوں سے خوبچند کی طرف دیکھ کر کہا۔ " بس یہی بات میں گل کیلئے ہمیشہ سوچتی تھی مگر بیان نہیں کر

سکتی تھی ۔

خوبچند خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ لاچی رخ پھیر کر تصویر کو دیکھنے لگی۔ بولی۔ "اب تم اس تصویر کا کیا کرو گے؟"

"میں اسے اپنے ساتھ پیرس لیجاؤں گا۔"

اور یکایک خوب چند کو احساس ہوا جیسے اُسے اس وقت کچھ کرنا چاہیئے یا تو لاچی سے جھگڑا کر کے اُسے کمرے سے باہر بھیج دینا چاہیئے یا زبردستی اپنے گلے سے لگا لینا چاہیئے یا اپنے سر کے بالوں کو نوچ لینا چاہیئے ورنہ یہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا اضطراب اُسے پاگل بنا دے گا۔ خوبچند نے ایک چھوٹی سی الماری میں کنجی لگائی اور اس میں سے خوشبو کی دو تین چھوٹی چھوٹی بوتلیں نکالیں اور انھیں تصویر پہ لگانے لگا۔ بالوں پر رات کی رانی، گردن پر جوہی، گھاگھرے پر گلاب!

"کیا کر رہے ہو؟" لاچی نے حیرت سے پوچھا

"تصویر کو خوشبو لگا رہا ہوں۔"

لاچی نے کہا۔ "بڑے عجیب آدمی ہو، خوشبو تو پیرس جاتے جاتے اُڑ جائے گی۔"

"مگر اس کی یاد تو باقی رہ جائے گی۔" خوبچند لاچی کیطرف مڑا۔ اور بولا۔ "لاچی کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ کسی دوسری چیز میں

تبدیل ہو جاتی ہے۔ خوبصورتی یاد میں، یاد نغمے میں، نغمہ گونج میں، گونج فضا میں، فضا لہروں میں اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے؟"

لاچی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، بولی

"قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ مجھے اس وقت گل یاد آ رہا ہے!"

"گُل! گُل! گُل!!!" یکایک خوب چند چیخا۔ "ہر وقت گُل! گٹ آؤٹ!"

"مگر میری ٹماٹر!"

"گٹ آؤٹ!" خوب چند دونوں ہاتھ پھیلا کر چیخا۔

لاچی دوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ راستے میں اُسے دو تین چپراسی دوڑتے ہوئے خوب چند کے کمرے کی طرف آتے ہوئے ملے۔ ایک چپراسی نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

لاچی بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیا ہوتا ہے؟ تم ہی بتاؤ جب کوئی مرد کسی عورت کو چاہتا ہے اور وہ عورت اُسے نہیں چاہتی، تو کیا ہوتا ہے؟"

دل آرا نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ مجھے پیرس لے جانا چاہتا ہے مگر ہر مرد صرف اپنے چاہنے کو چاہتا ہے۔ وہ نہیں دیکھتا کہ عورت کیا چاہتی ہے۔"

"ہائے پیرس!"

کوشلیا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے چمکنے لگیں۔

"اُسے بولو وہ مجھے پیرس لے چلے!"

دوسری عورتیں ہنسنے لگیں۔ لیکن لاچی کو ہنسی نہ آئی۔ وہ سر جھکا کر اپنے گوشۂ تنہائی میں چلی گئی۔

تین روز تک لاچی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ وہ تین روز تک بخار میں پھنکتی رہی۔ تین روز تک ڈاکٹر اسے آ کے دیکھتا رہا۔ اور دوا دیتا رہا۔ لیکن بے سود، لاچی کا بخار بڑھتا ہی گیا۔ پانچویں روز ڈاکٹر بہت سنجیدہ اور متفکر سا چہرہ بنائے ہوئے لاچی کے کمرے سے باہر نکلا۔ وارڈر اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ باہر چنیاں بائی، کالی چرن اور خوب چند کھڑے تھے ڈاکٹر نے ان لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"حالت خطرناک ہے۔ اُسے فوراً ہسپتال میں بھیجنا ہوگا۔"

"جیل کے ہسپتال میں؟" خوب چند نے پوچھا۔

"نہیں!" ڈاکٹر سٹیتھسکوپ جھلاتے ہوئے بولا۔ "اُسے

متعدی بیماریوں کے ہسپتال میں بھیجا ہوگا!"

"متعدی امراض کے ہسپتال میں کس لئے؟" خوب چند نے گھبرا کے پوچھا۔

"اس کے چیچک نکل آئی ہے۔"

ہسپتال کی دنیا ایک تاریک اور مہیب دنیا تھی۔ وہ ہذیانی دنوں اور بیہوش راتوں کی دنیا تھی۔ لاوے کیطرح کھولتے ہوئے دماغ اور آگ کیطرح جلتے ہوئے اور پیپ کیطرح رِستے ہوئے زخموں کی دنیا تھی۔ ارے کتنے بڑے گڑھے تھے اس میں، جیسے وہ قدم قدم پر پیپ اور لہو، لاوے اور کیچڑ میں دھنستی چلی جارہی ہو۔ اور اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا اور وہ چیخ چیخ کر گل کو پکارتی اور جب وہ چیختی تو اندھیرے میں کہیں کہیں بجلی کوندتی۔ کہیں کہیں سیاہ گرجتے ہوئے بادل پھٹتے ہوئے نظر آتے اور گدلے آفاق کے سراسیمہ ہیولوں میں اُسے کبھی گل، کبھی کالی چرن، کبھی خوب چند کی پرچھائیاں نظر آتیں۔ اور نظر آتے ہی اوجھل ہو جاتیں۔ آنکھوں پر سرسراتے ہوئے گدلے مٹیالے پردے چھا جاتے۔ اور وہ آنکھوں کے پٹ کھول کھول

کر اپنی خانہ بدوش ماں اور باپ کو آواز دیتی۔ روح کی پوری طاقت سے اپنے قبیلے کو پکارتی اور اس خدا کو پکارتی جو سات زمینوں اور سات آسمانوں سے پرے کسی غیر مرئی دنیا میں کھڑا اس پر ہنس رہا تھا۔ وہ غم اور غصے سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی تو ادھ کچے پانی اور پیپ ملے لہو کی دھاروں سے اس کا منہ بھر جاتا اور وہ غوں غوں کر کے بیہوش ہو جاتی ..... یوں بھی اُسے ہوش کم آتا تھا۔ یا تو مکمل بے ہوشی ہوتی تھی یا نیم بیہوشی، چیچک اور بخار اس کے جسم کے خلیوں میں یوں چل رہے تھے جیسے تیز رفتار آندھی بادلوں کو لئے ہوئے گرد و غبار اُڑاتی ہوئی اور درختوں کو جھکاتی ہوئی، چھپروں کو توڑتی ہوئی۔ انسانی بستیاں اُجاڑتی ہوئی، چاروں طرف تباہی مچاتی ہوئی، اس کے خوبصورت جسم و جاں کو اپنے پاؤں تلے روندتی ہوئی گزر رہی ہو۔ ایک قعرِ فنا تھا جس میں وہ گرتی چلی جا رہی تھی۔

ایک گردابِ مسلسل تھا جس میں وہ غوطے کھا کر ایک حقیر بے بضاعت بیجان تنکے کی طرح گردش کر رہی تھی۔ آسمان سر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ زمین پاؤں کے نیچے پھٹ گئی تھی۔ لال، اودی، نارنجی روشنیاں پھلجھڑیاں، ستارے، تارے .... رے .... رے .... ریشے ریشے .... کیچڑ .... کیچڑ .... کائی .... جھیل، جھیل، جھیل جھل

جھل کرتی جونکیں، کلبلاتے ہوئے کیڑے اس کے جسم پر رینگ رہے تھے۔ "بچالو! گل! مجھے بچالو۔ دیکھ لو یہ لاوا میری آنکھوں میں اُبل رہا ہے یہ شعلے میرے جسم کے روئیں روئیں میں گھسے جا رہے ہیں۔ جھاڑیاں، جنگل، تکوے، کانٹے، آبلے، ریت میں ریت ہی ریت، کھیت، سمیت، جمیت پر خ چرخ میں ٹوٹی، میں گری میں ڈوبی..... بچاؤ..... بچاؤ..... "

جب ستائیس دن کے ہذیانی بخار کے بعد طوفان تھما، آندھی رُکی اور لاوا منجمد ہوا تو لاچی نے ایک گہری اور بسیط تاریکی میں آنکھیں کھولیں اب وہ ہمیشہ کیلئے اندھی ہو چکی تھی اور اس کی خستہ اور بدنما ہڈیوں کے ڈھانچے پر منڈھی ہوئی مرجھائی ہوئی کھال پر اتنے بڑے بڑے تاریک گڑھے تھے جیسے کسی نے اس کے حسن کے نیچے بارود رکھ کر اُسے فیتے سے اڑا دیا ہو۔

مزید تین ماہ کے بعد لاچی کو ہسپتال سے جیل واپس بھیجا گیا۔

ایک بار پھر لاچی کی حاضری سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں ہوئی۔ اسی کمرے میں وہ لائی گئی جہاں جیل میں آنے کے پہلے روز وہ لائی گئی تھی۔ جیل کے بہت سے لوگوں کو لاچی کے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ حاجی اور میر چندانی کوشلیا اور جنیاں، کالی چرن اور دوسرے لوگ۔ صرف یہ دیکھنا چاہتے

تھے کہ لاجی کے حسن کیساتھ چیچک نے کیا سلوک کیا ہے۔ انھیں ہسپتال سے وقتاً فوقتاً جو رپورٹیں ملتی رہتی تھیں، ان پر انھیں کامل اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے لاجی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو تصویر اپنی نظر سے دل میں اُتر جاتی ہے، وہ اس وقت تک نہیں مٹتی، جب تک انسان پھر اپنی آنکھوں سے تبدیلی کا مشاہدہ نہ کرلے۔ سب اُسے دیکھنا چاہتے تھے۔

مگر ایک خوبچند تھا جو اُسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس نے یہ انتظام ضرور کرلیا تھا کہ جب لاجی اس کے کمرے میں لائی جائے اس وقت وہ تنہا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسروں کو اپنے ردِعمل سے آگاہ ہونے دے۔ جب خوبچند نے اشارہ کیا۔ تو جو لوگ لاجی کو خوبچند کے کمرے میں لائے تھے اُسے اکیلی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

جب لاجی اندر آئی تو خوبچند کا ہاتھ بے اختیار اپنی آنکھوں پر چلا گیا۔ جیسے وہ آنکھیں یہ منظر دیکھنا نہ چاہتی ہوں۔ لیکن وہ اس ملاقات کے دوران میں پورے وقت اپنی آنکھیں بند کئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے لاجی کو دیکھنا ہی پڑا۔ اور پہلی ہی نگاہ میں لاجی کی بدصورتی ایک برچھی کیطرح اس کے دل میں اتر گئی۔ کہاں تھی وہ متاعِ بے بہا جسے لیکر وہ پیرس جا رہا تھا۔ وہ پھول کیطرح شگفتہ اور زندگی کیطرح شاداب

حسن، جس کی تصویر مہینوں کی محنتِ شاقہ کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی، کیا یہی وہ لاچی ہے جس نے اس کے جذبات میں ہلچل مچادی تھی۔ جس کے تخیل نے اس کی راتوں کی نیند حرام کردی تھی جس کے پائے ناز پر سر رکھ دینے کیلئے وہ بیقرار ہو اُٹھا تھا۔ یہ بدہیئت بدنما جسم، یہ خوفناک چہرہ، پھٹے ہوئے ہونٹ، مُڑی ہوئی ٹھوڑی، بیٹھی ہوئی ناک، اور تاریک گڑھوں میں چمکتی ہوئی بے نور سپید سپید آنکھیں، کیا یہی وہ لاچی ہے میرے خدا!

"سُپری ٹان!" لاچی آہستہ سے بولی۔ "مجھ سے بات بھی نہیں کرو گے؟"

"نہیں لاچی!" خوب چند گھبرایا ہوا بولا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ مجھے بہت دھچکا سا لگا ہے....."

"میں بدصورت ہوگئی ہوں نا؟"

لاچی نے خوبچند سے پوچھا۔

وہ اس سوال سے اور بھی گھبرا گیا۔ فوراً انکار کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں لاچی! یہ بات نہیں ہے..... تم اس کرسی پر بیٹھو۔" خوبچند نے ہاتھ کا سہارا دے کر لاچی کو کرسی پر بٹھانا چاہا۔ لیکن لاچی نہیں بیٹھی، بولی۔

" میں تو تمہاری قیدی ہوں سپری ٹان۔ میں تمہارے سامنے کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ "

" ہسپتال میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ؟ " خوبچند جلدی جلدی سے بولنے لگا۔ میں تمہیں خود دیکھنے کیلئے آنا چاہتا تھا. لیکن ادھر جیل میں کام یکلخت اتنا بڑھ گیا کہ پل بھر کیلئے بھی فرصت نہیں ملتی تھی لیکن دل میں ہمیشہ تمہیں یاد کرتا تھا، یہاں جیل میں ہر شخص تمہارے اعلیٰ اخلاق، اونچے کردار اور بلند سیرت ......"

" سپری ٹان ! " لاچی نے خوبچند کی اِن سطحی باتوں کو بیچ ہی سے کاٹ دیا. کیونکہ آخر ان باتوں کا مطلب ہی کیا تھا.

" ہاں لاچی ! "

" مجھے پیرس لے چلو گے نا ! "

" پیرس ؟ ۔ اوہ ۔ پیرس ؟ ۔ ہاہا ۔ " خوبچند کھسیانی ہنسی ہنسا.

" ہاں ۔ اور صرف میری تصویر بنایا کرو گے نا ؟ کیونکہ کبھی کبھی ایک شخصیت، ایک سمندر ہو جاتی ہے۔ اور میں بھی تو ایک سمندر ہوں ۔ کیا ہوا اگر مجھ میں تھوڑا سا کوڑا کرکٹ آن ملا ہے۔ سمندر میں تو سینکڑوں ہزاروں ٹن انسانی غلاظت دریاؤں کے ذریعے

آکر گھل جاتی ہے، ہے نا؟"

لاچی کی آواز میں شدید تلخی تھی!

" اے — اے — لاچی — سنو لاچی! تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔"

یکایک لاچی کا دل بیٹھنے لگا۔

گل واپس آگیا ہے! ضرور گل واپس آگیا ہے!!

لاچی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اب وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کرسی کے بازو کا سہارا لے کر یکایک وہ بیٹھ گئی۔ اور بہت کمزور آواز میں بولی۔

" گل واپس آگیا ہے؟ اس کی چٹھی آئی ہے؟"

" نہیں۔!"

خوبچند نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے کہا۔

اور یہ نہیں، سن کر جیسے لاچی کی رکی ہوئی سانس کی آمدورفت پھر سے شروع ہوگئی۔ رگوں میں پھر سے خون دوڑنے لگا۔ اور وہ خوف اور وحشت جس نے گویا اس کے گلے کو پکڑ لیا تھا۔ آپ ہی آپ کہیں زائل ہوگئے۔

" گورنمنٹ نے میری سفارش پر تمہارے اعلیٰ چال چلن

اور تمہارے جیل کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے تمہاری باقی سزا معاف کر دی ہے۔ آج سے تم آزاد ہو جہاں چاہے جا سکتی ہو۔"

"جہاں چاہے جا سکتی ہوں۔"

یہ الفاظ تیر کی طرح لاچی کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ کبھی اس نے سوچا تھا، جیل سے آزاد ہو کر وہ اپنے گل کے ملک میں جائے گی اور اُسے ڈھونڈے گی، پیدل پیدل چل کر، منزل منزل ٹھہر کر ایک دن وہ گوہر مقصود کو پالے گی۔ لیکن جب تو اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جو کروڑوں انسانوں کے چہروں میں اپنے محبوب کا چہرہ تلاش کر سکتی تھیں۔ اب وہ وسیع بیکنار تاریکی کی پہنائیوں میں کھو کر کس طرح اپنے گل کو ڈھونڈ سکتی ہے قدرت اس سے سب کچھ لے لیتی لیکن آنکھیں تو رہنے دیتی آنکھیں جو محبوب کو دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں۔"

"اب تم کہاں جاؤ گی لاچی ؟"

خوب چند نے سوال کیا اور لاچی کے خیال کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

لاچی نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "اب تو کہاں جائے گی لاچی ؟" یہ جیل کی چہار دیواری جو چند ماہ کیلئے ایک بے کس

اندھی کیلئے جائے پناہ ثابت ہوتی، وہ بھی ان لوگوں نے تجھ سے چھین لی. اب تو کہاں جائے گی؟ جس کیلئے تو نے قبیلہ چھوڑا اور جس کے لئے قبیلے نے تجھے چھوڑ دیا، وہ بھی تو یہاں موجود نہیں ہے۔ پھر ڈھونڈ لے، یہ دنیا تو بہت بڑی ہے کہیں نہ کہیں تجھے بھی سہارا مل جائے گا۔ خیال دوڑا لے چاروں طرف! کیا تیرا یہاں کوئی نہیں ہے۔؟

لاچی نے اپنے ذہن میں چاروں طرف خیال دوڑایا لیکن وہ اندھی ہو چکی تھی۔ کچھ نہ دیکھ سکی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

" مجھے جیل خانے کے باہر چھوڑ دو۔ جہاں جانا ہوگا میں خود چلی جاؤں گی۔ "

خوب چند نے جلدی سے گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم اندر آیا خوب چند نے کہا۔

" لاچی کو کالی چرن صاحب کے دفتر میں لے جاؤ۔ وہ تمام ضروری کاغذات دیکھ کر اسے رہا کر دیں گے۔ "

ملازم لاچی کو سہارا دیکر خوب چند کے دفتر سے باہر لے گیا۔ خوب چند رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ دل ہی دل میں وہ خدا کا شکر بجا لایا۔ زیادہ تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی اور

معاملہ آسانی سے ٹل گیا۔

کالی چرن کا دفتر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جیل کی تین چار عورتیں، جیناں بائی، میر چندانی اور حاجی عبدالسلام سبھی موجود تھے۔ اور حیرت، تاسف، ہمدردی اور استہزا کے ملے جلے جذبات سے لاچی کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن سب دم بخود اور خاموش تھے۔ لاچی کی خوبصورتی نے جس طرح ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا تھا، اس کی بدصورتی نے اسی طرح ان کے جذبات کو یخ بستہ کر دیا تھا۔ اگر اس وقت وہ یہ سوچتے تھے کہ ایسی خوبصورتی ممکن نہیں ہے تو اس وقت ان کا خیال تھا کہ ایسی بدصورتی کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

کالی چرن نے تمام ضروری کاغذات پر لاچی کا انگوٹھا لگوایا۔ اب اس کی رہائی کا وقت آگیا تھا۔

لاچی بولی

"حاجی جی یہاں ہیں؟"

"ہاں موجود ہیں!"

کالی چرن بولا۔

"اور میر چندانی۔؟"

" وہ بھی میں، کیوں ؟ "

کالی چرن نے پوچھا

لاچی نے کہا۔

" ایک بار ان لوگوں نے جیناں بائی کے ذریعے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ میری آبرو لینے کے عوض پچاس ہزار روپیہ دیں گے۔ میں بدصورت ضرور ہو چکی ہوں لیکن میری آبرو سلامت ہے — "

دفتر میں سناٹا چھا گیا۔ لاچی نے اپنی اندھی آنکھیں جھپکائیں اور حاجی اور میر چندانی کی طرف مڑ کر بولی۔

" آج بولی ہو جائے۔ آؤ آج لاچی کی آبرو کو نیلام کریں بولو حاجی، بولو میر چندانی، پچاس ہزار دینے والو، آج پانچ سے روپے سے شروع کرو۔ پانچ روپے ایک .... پانچ روپے ایک .... پانچ روپے دو .... ایں ؟ کیا آج کوئی بھی بولی نہ دے گا۔ "

سب خاموش بیٹھے رہے۔

یکایک لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔ زہریلی ہنسی کا ایک ریلا سا تھا جس سے اس کا دبلا پتلا مریل سا جسم لرز لرز

جاتا تھا۔

سب خاموش رہے۔ کالی چرن نے اشارہ کیا۔ اور دو وارڈر اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جیل سے باہر چھوڑ آئے۔

باہر کی دنیا بھی اتنی تاریک تھی جتنی جیل کے اندر کی دنیا۔ دراصل لاچی ابھی اپنے اندھے پن سے اچھی طرح مانوس نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ جیل سے باہر نکلی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آسمان کیطرف اُٹھ گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کھلا نیلا آسمان دیکھے گی۔ روشن چمک دار دھوپ دیکھے گی۔ سفید سفید بادلوں کو پاکیزہ آرزوؤں کی طرح لہلہاتے ہوئے دیکھے گی۔ اُسے لوگ نظر آئیں گے، موٹریں، سڑک کے کھمبے، خوبصورت ساڑیاں، دلکش بچے، رنگین غبارے اڑاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے، خوشی کی دھن میں مچلتے ہوئے ایک لمحے کیلئے جیل سے باہر نکلتے ہوئے اس کے دل میں یہ تمام تصویریں آئی تھیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں جب اس نے آسمان کو تاریک دیکھا اور زمین کو سیاہ اور اُسے اُفق سے اُفق تک ایک گہری دبیز چادر تنی ہوئی نظر آئی۔ تو اس کے صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ اور وہ وہیں جیل کے باہر فٹ پاتھ پر گر گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زمین

کی مٹی اس کی آنکھوں میں تھی۔ اس کے ہونٹوں میں تھی اور اس کی اندھی آنکھوں کا عجز، اور اس کے بے قرار دل کا لہو آنسوؤں کی صورت میں بہہ بہہ کر دھرتی میں جذب ہو رہا تھا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آنسو صرف آنسو ہے۔ پانی نہیں ہے۔ پانی سے دھرتی میں چھپا ہوا بیج پھوٹ کر ابھر آتا ہے لیکن آنسو سے دل کا غم نہیں ابھرتا۔ ورنہ آج سطح زمین پر جگہ جگہ غم کے پودے اگتے۔ اور چپے چپے پر انسان کے ظلم کی دہائی دیتے

اسٹیشن یارڈ میں ہنگامہ تھا۔

رسک لال اپنی ڈھیلی پگڑی سنبھالتا ہوا اِدہر سے اُدہر دوڑ رہا تھا اسٹیشن سے آگے کی لائن خراب ہو چکی تھی۔ اس لئے فرنٹیئر میل دہلی سے آتے ہوئے اسی اسٹیشن پر چند گھنٹوں کیلئے رکنے والی تھی۔ آج تک فرنٹیئر میل ایسی عظیم الشان گاڑی کبھی اس اسٹیشن پر رُکی نہ تھی۔

رسک لال بہت خوش تھا اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اور قلی، کانٹے والے، سگنل مین، یارڈ مستری سب لوگوں کی شامت بلائے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فرنٹیئر میل نہیں، گورنر صاحب اسٹیشن پر قیام

کرنے کی غرض سے آرہے ہیں ۔

اسٹیشن سے باہر مادھو فروٹ والا، اور حمید ٹیکسی والوں کا سرغنہ بھی بے حد خوش تھے، آج گاہکی بڑھ جائے گی۔ اس لئے فروٹ اور ٹیکسی دونوں کے دام بھی بڑھ جائیں گے۔ پرائیویٹ ٹیکسیوں تک کا دھندا چمک جائے گا۔ کیونکہ بہت سے لوگ اتنی دیر تک فرنٹیئر میل کے رُکے رہنے کا انتظار نہ کریں گے اور یہیں سے ٹیکسی لے کر اور بچوں کیلئے پھل خرید کر شہر کو چل دیں گے۔ مادھولال جلدی جلدی سے پھلوں پر اپنا گندہ رومال گھس گھس کر ان کو جوتوں کی طرح چمکا رہا تھا۔

ٹیکسی والوں نے اسٹیشن کے باہر ایک طرف لائن لگالی تھی۔ دوسری طرف کنکر بجری اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر کے پاس سڑک کوٹنے والا انجن بھی بھاپ نکال رہا تھا۔ سڑک کی مرمت جاری تھی پان والے کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ آج دو دنوں کی سرد بازاری کی کسر پوری ہو جائے گی۔

فرنٹیئر میل آگئی اور چار نمبر کے پلیٹ فارم پر رُک بھی گئی۔ لیکن ہنگامہ کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ اور مسافر بھی بڑی تعداد میں نہیں اُترے۔ کیونکہ گاڑی کے رُکتے ہی خبر آگئی کہ آگے کا راستہ صاف ہو چکا ہے اس لئے اب گاڑی چند گھنٹے رُکنے کی بجائے صرف چند منٹ ہی رُکے گی۔

اس لئے جن مسافروں نے یہاں سے اتر کر ٹیکسی لے کر شہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ انھوں نے جب پلیٹ فارم کے لاوڈ اسپیکر سے یہ خوشگوار خبر سنی تو اُترنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی میں بیٹھے رہے اور قلی اور پان والے، فروٹ والے، ٹیکسی والے اور پرائیویٹ گاڑی والے سب کے سب ناامید ہو کر اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔

"دھت تیرے کی! آج اپنا لک ہی خراب ہے!"

حمیدا ٹیکسی والے نے ریل کی پٹڑی پر پان کی پیک زور سے ڈالتے ہوئے کہا۔

گاڑی سے چند ہی مسافر اُترے۔ ان میں ایک گل بھی تھا۔ حمیدا نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر گل کیطرف بڑھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس سے بڑے زور سے مصافحہ کیا۔

"میں نے سمجھا تم پاکستان چلے گئے۔ بہت عرصے سے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"والد تو پاکستان چلے گئے مگر میں دہلی میں تھا اور اتنے عرصے سے یہی کوشش کر رہا تھا کہ یہاں کی شہریت مل جائے۔"

"تو کیا ہوا۔ کچھ کامیابی کی صورت نظر آئی؟"

"ہاں!" گل نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے یہاں کی شہریت

مل گئی ہے۔"

"لاچی کا کیا حال ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟" گل بولا۔ "دہلی سے میں نے تین چار خط جیل کے پتے پر لکھے تھے کسی کا جواب نہیں آیا۔ اب کل جیل جاؤں گا تو اس سے ملوں گا۔"

"اب اس کی سزا تو ختم ہونیوالی ہے نا؟" حمیدا نے پوچھا۔

"ہاں!" گل خوش ہو کر بولا۔ "صرف چار ماہ رہ گئے ہیں۔ میرے حساب سے!"

دونوں باتیں کرتے کرتے ایرانی ریستوران کے قریب آپہنچے تھے۔ جس کا ایک دروازہ اسٹیشن کے اندر تھا۔ تو ایک کونٹر اسٹیشن کے باہر بھی تھا۔ جہاں سے اسٹیشن کے باہر کا تمام نظارہ دکھائی دیتا تھا۔

"آؤ چائے پیو!"

گل نے حمیدا سے کہا۔

"نہیں۔ میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ شاید کوئی گاہک مل جائے!"

حمیدا نے سر ہلا دیا۔ اور باہر چلا گیا۔

گل نے ریستوران کے اندر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ اور اپنی شہریت کے کاغذات نکال کر ان کا غور سے مطالعہ کرنے لگا۔

اسٹیشن کے باہر سڑک پر ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اور لوگ باگ فرنٹیئر میل سے مایوس ہو کر اس دوسرے ہنگامے سے دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ بات بڑی معمولی تھی۔ ایک اندھی بھکارن بھیک مانگتی ہوئی ایک مسافر سے ٹکرا گئی تھی اور مسافر نے اُسے گالی دی تھی اور اندھی بھکارن نے گالی خوشی سے قبول کرنے کی بجائے مسافر کی بانہہ پکڑ لی تھی اور اس کے منہ پر دو گھونسے لگا کر اُسے زمین پر گرا دیا تھا۔ ایسا واقعہ آج تک کسی نے دیکھا، سنا نہ تھا۔ اس لئے سب لوگ بھکارن کے خلاف ہو گئے تھے۔

اور پھر وہ بھکارن تھی بھی عجیب۔ اس کا سارا چہرہ چیچک کے گہرے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی صورت بیحد خوفناک تھی اور کپڑے چیکٹ میلے اور جگہ جگہ سے تار تار۔ وہ صورت شکل سے ایک بھیانک ڈائن یا چڑیل سے کم نہ تھی۔

"حرامزادی! پیسہ نہیں دیتے ہیں تو زبردستی کرتی ہے گھونسا مارتی ہے۔"

"مگر تو نے مجھے گالی کیوں دی؟"

لاچی زور سے چلائی۔ جانے اُسے کیا ہو گا تھا کئی مہینوں سے اس نے اِدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ شہر کے دوسرے حصوں

میں بھیک مانگ کر اپنی گزر کرتی تھی۔ اس نے کبھی اس اسٹیشن کا رُخ نہیں کیا تھا، جہاں کسی زمانے میں اس کا قبیلہ رہتا تھا، جہاں اس کے محبوب کا پل تھا۔ جس کے اسٹیشن یارڈ کے چپے چپے پر اس کے حسن وجمال کی داستانیں رقم تھیں۔

لیکن دل کو ہزار بار سمجھانے پر بھی وہ اِدھر آنے سے نہ رُک سکی۔ شاید اُسے اپنے وطن کی مٹی بلا رہی تھی۔ ہاں یہی اسٹیشن یارڈ تو اس کا وطن تھا۔ شاید ناآسودہ حسرتوں کی تمنا یا ماضی کے سپنے اُسے اِدھر بُلا لائے تھے۔ کچھ بھی ہو، آج وہ اِدھر آ ہی گئی تھی۔ راستہ پوچھتے پوچھتے، پتھریلی بے رحم سڑکیں، ٹٹولتے ٹٹولتے آج اپنے ماضی کیطرف پلٹ آئی تھی۔ شاید یہ دھرتی اُسے پہچان جائے۔ شاید یہاں کسی بہتر سلوک کی آرزو جاگ جائے۔ شاید؟ شاید؟

اِسی لئے اُسے اتنا غصہ آیا تھا۔ جب اُسے مسافر نے گالی دی تھی۔ وہ تو اس اسٹیشن یارڈ کی ملکہ تھی۔ اس علاقے کی رانی۔ جہاں پر اس کے قدم پڑتے تھے وہاں پر اس علاقے کی مخلوق آنکھیں بچھاتی تھی۔ اس نے اس مسافر کو بتا دیا کہ وہ ابھی تک وہی لاچی ہے۔"

اس نے مسافر کی گالی سن کر اسی وقت اس کا بازو پکڑ کر دو طمانچے رسید کر دیئے تھے۔ غم اور غصے سے اس کا سارا جسم

کانپ رہا تھا۔

پھر کسی نے اس کی چھڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور ایک زور کا تھپڑ مار کر بولا۔

" حرامزادی! ایک تو بھیک مانگتی ہے۔ اوپر سے شریف آدمیوں پر ہاتھ اُٹھاتی ہے!"

لاچی نے آواز پہچان لی۔ یہ حمید اٹیچی والا تھا۔ ایک لمحے کیلئے وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ پھر غم اور غصے کا جذبہ ایک سیلاب کیطرح اُمڈ آیا اور وہ بپھر کر بولی۔

" اندھی جان کے میری بے عزتی کرتا ہے۔ میرے نزدیک تو آ، تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی، جانتا ہے میں کون ہوں؟"

لاچی زور سے چلائی۔

" شیطان کی خالہ ہے، بدذات چڑیل ہے، قبرستان کی ڈائن ہے اور کون ہے تو ...... بہت آتی ہیں تجھ جیسی یہاں اڈے پر بھیک مانگنے والیاں۔"

حمید انے غصے سے کہا۔

پھر اس نے لاچی ہی کی چھڑی سے ایک اور بھرپور وار اس کی پیٹھ پر کیا۔ لاچی تڑپی، تلملائی، چکرائی، اس کے بازو حمید اکو ٹٹولتے

ہوئے چاروں طرف بڑی بے بسی سے گھومے، اس کی ان حرکات کو دیکھ کر اسکول سے آتے ہوئے بچّے ہنسنے لگے۔ چند بچّوں نے سڑک پر پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر سے پتھر اُٹھا لیے اور اندھی کو مارنے لگے۔

"مارو! مارو!!"

چند لڑکے خوشی سے چلّائے۔

وہ مسافر جسے لاچی نے گھونسا مار کے گرایا تھا۔ اس نے بھی ایک پتھر مارا۔ لاچی کے ماتھے سے خون نکل آیا۔ وہ لڑکھڑا کر بھاگنے لگی۔ لوگوں کے مجمع نے اُسے دوسری طرف دھکیل دیا۔ مادھو چھیل والے نے پتھر مار کے غصے سے کہا۔

"مارو! مارو!!"

یہ پتھر لاچی کے شانے پر جا لگا۔ لاچی نے مادھو کی آواز پہچان لی۔ دل ہی دل میں بولی۔

"یہ مادھو ہے!"

"مارو! مارو سالی کو۔"

پان والے نے پتھر اٹھایا۔

"یہ سکھیا پان والا ہے!" لاچی نے اپنے دل میں کہا۔

لاچی اب زمین پر گر چکی تھی۔ اور اس پر چاروں طرف سے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا تھا اور زمین کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی اور پتھر اس کے جسم کو چھلنی کر رہے تھے۔ یکایک مجمع چھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ لوگ تتر بتر ہو کر بھاگنے لگے۔

پولیس والوں کے قدموں کی آواز قریب آگئی۔ پھر کسی نے دونوں بازوؤں سے اُسے اُٹھا لیا اور اُسے لیکر ایرانی ریستوران کی طرف دوڑا۔ دو میزیں جوڑ کر اُسے لٹا دیا اور کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

"پانی لاؤ! پانی لاؤ!!"

یکایک لاچی چونکی، یہ گل کی آواز تھی۔ جو اس کے رگ و ریشے میں سمائی جا رہی تھی۔ یہ گل کے ہاتھ تھے جو اس کے چہرے کے زخموں کو دھو رہے تھے۔ یہ ابرِ رحمت کے قطرے تھے جو اس کی اندھی آنکھوں کو ایک مستور بینائی بخش رہے تھے۔ "یہ تو میرا گل ہے! یہ تو میرا گل ہے!!"

"کیا ہوا؟"

ایک پولیس والے نے گل سے پوچھا۔

"مجھے خود معلوم نہیں۔ میں یہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شور سن کر باہر گیا تو دیکھا لوگ اس کے پتھر مار رہے تھے۔ میں اسے اُٹھا کر ان لوگوں کے نرغے سے نکال کر یہاں لے آیا ....."

"اچھا کیا۔!"

"جب یہ ہوش میں آجائے گی تو تم اس بیچاری کی رپورٹ ضرور درج کرنا سنتری جی!"

سنتری زور سے ہنسا۔ "اگر ایسے بھکاریوں کی رپورٹ درج کرتے پھریں تو شہر کی پولیس کچھ اور کام ہی نہ کر سکے۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

ایرانی کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ گل نے جلدی جلدی کسی طرح ان زخموں کی مرہم پٹی کی۔ لیکن پھر بھی اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا۔ اور ڈاکٹر کی دکان اسٹیشن سے باہر پان والے کی دکان کے برابر واقع تھی۔

گل نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم چل سکتی ہو۔؟"

لاچی نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور یہ بالکل سچ تھا وہ اپنے اندر ذرا بھی طاقت محسوس نہ کرتی تھی۔ شاید وہ زخموں سے

نڈھال ہو کر بھی وہاں سے چلی جاتی۔ لیکن گل کی آمد نے اس کی روح اور جسم کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ گل نے اُسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور ایرانی سے بولا۔

"میں اِسے ڈاکٹر کی دکان تک لے جاتا ہوں۔"

لاچی نے جب اپنا سر گل کے کندھے پر محسوس کیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا رونا تو اُسے آج تک نہ آیا تھا۔ ہر محرومی، ہر یاس، ہر حسرت، ہر یاد دل کی گہرائیوں سے ایک جھرنے کی طرح پھوٹ نکلی تھی۔

کاش انہی بازوؤں میں اس وقت اس کا دم نکل جائے تو کتنا اچھا ہو۔

یہ تاریک رات کا سفر اگر اپنے محبوب کے بازوؤں میں کٹ جائے تو موت کتنی دلکش ہو جائے۔ ارے میرے ظالم خدا! میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اسی لمحہ میری جان لے لے مجھے اس کندھے پر ہمیشہ کیلئے سو جانے دے۔

گل نے ڈاکٹر کی دکان کے اندر جا کر اُسے سہارا دے کر بینڈ پر بٹھا دیا۔

ڈاکٹر نے زخموں کا معائنہ کیا۔ زخم دیکھ کر کہا۔

"زخم معمولی ہیں، گہرے نہیں ہیں۔ ہفتے بھر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ روز پٹی کیلئے آنا پڑے گا۔"

"اس کا نام؟"

گل لاچی کیطرف مڑا۔ پوچھنے لگا۔

"تمہارا نام؟"

لاچی خاموش رہی، خاموش رہی، خاموش رہی، دل کا طوفان بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا، قیامت کے شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ یہ گل کی آواز تھی کہ صورِ اسرافیل تھا۔

تمہارا نام! تمہارا نام!! تمہارا نام!!! جیسے زمین اور آسمان کے دہانوں سے آتش فشاں لاوا پھٹ پڑا ہو۔ اور رعد کی آواز سے گرجتا ہوا لاچی کے چاروں طرف گھوم رہا ہو۔

"ڈاکٹر صاحب تمہارا نام پوچھتے ہیں۔"

گل نے پھر بڑی ملائمت سے کہا۔

"میرا تو کوئی نام نہیں ہے۔"

آخر لاچی نے بڑی مشکل سے کہا۔

"سچ کہتی ہے!" ڈاکٹر نے جلدی جلدی سے پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ "سڑک پر بھیک مانگنے والی ان اندھی بھکارنوں

کا بھلا کیا نام ہوتا ہوگا؟ "

" ایسا تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!" گل نے مسکرا کر کہا۔
" اِن اندھی بھکارنوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اڈے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں یہ روز رات کو پہنچ جاتی ہیں۔ "

" تم سچ کہتے ہو! "

لاچی نے اپنے دل سے کہا۔ کبھی میرا بھی ایک نام تھا اور کبھی میرا بھی ایک گھر تھا۔ جہاں میں ہر روز اپنے خیالوں میں پہنچ جاتی تھی۔ رات کو بھی اور دن کو بھی، صبح کو بھی اور شام کو بھی لیکن آج میرے خیالوں میں وہ رات آئی ہے جس کی کوئی صبح نہیں ہے اب میں کہاں پہنچوں گی اور کس کو آواز دوں گی اور کس کو اپنا نام بتاؤں گی اور کس گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی ڈاکٹر! ڈاکٹر!! کیوں اس نشتر سے میرے زخم کو کریدتے ہو؟ اِسے میرے دل میں چھبو دو نا، تاکہ زندگی کی ساری جلن ایک ہی لمحے میں ختم ہو جائے۔"

ڈاکٹر نے پیڈ سے ورق پھاڑ کر گل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ " پانچ روپے! اور اگر اگلے سات دن پٹی کراؤ گے تو سات روپے اور ہوں گے۔ "

گل نے جیب سے بارہ روپے نکال کے ڈاکٹر کو

دیتے ہے۔ بولا۔

"یہ سات روپے کہاں سے لائے گی۔ یہ بھی میں ہی دیئے دیتا ہوں۔"

پھر وہ لاچی کیطرف مڑکر بولا

"روز پٹی کرانے آجایا کرو۔"

"بہت اچھا۔"

لاچی بڑی مدھم آواز میں بولی۔

گل لاچی کو سہارا دے کر دکان سے باہر لایا۔ باہر لا کے بولا ۔۔۔

"کہو تو میں تمہارے اڈے پر پہنچا دوں ؟"

"نہیں، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

گل چپ رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

"تمہارا اڈہ کہاں ہے ؟"

"میرا اڈہ ؟" لاچی بولی۔ جہاں رات پڑ گئی وہیں اڈہ ہے بالو! تم نے بہت کر دیا۔ اب تم جاؤ بالو اپنے گھر جاؤ۔"

یکایک لاچی کا گلا بھر آیا۔ گل اس کیطرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے مڑا اور سر جھکا کر چلنے لگا۔

وہ جارہا ہے، وہ جارہا ہے، وہ جارہا ہے، وہ جا رہا ہے، وہ اب تجھے کبھی نہیں ملے گا، تو اُسے کبھی نہ دیکھ سکے گی، کبھی چھو نہیں سکے گی، اس کی یاد میں بلک بلک کر مرجائے گی اور اُسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔

یکایک لاچی لڑکھڑاتی ہوئی گل کے قدموں کی آواز پر دوڑی۔ اس نے اپنی دونوں باہوں سے گل کو پکڑ لیا۔ اور اس کے سینے سے اپنے چہرے کو چھپاتی ہوئی بولی۔

"گل — !"

"گُل — !!"

"گُل — !!!"

"مجھے پہچانتے نہیں ہو — میں لاچی ہوں —"

مِلن کی رات آئی تھی۔ مگر کسی کے لئے کتنی مہیب اور خوفناک، ڈر اور وحشت سے معمور، اور کسی کیلئے کیسی چمک دار اور درخشندہ۔ کائنات کی ساری خوشبوؤں سے بھرپور ایک، ہی رات تھی۔ مگر دونوں کیلئے کتنی مختلف تھی۔

لاچی اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھر کر گل کے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ اور گل سوچ رہا تھا، یہ ایک رات میں دو راتیں کیسے ممکن ہیں؟ ایک رات تاریک اور سیاہ، گہری اور اتھاہ، بدہیئت اور بدبودار، غلاظت اور نجاست سے معمور، اور دوسری

رات ستھرے ستھرے جذبات والی، معصوم اور پاکیزہ رات، جب کہکشاں مسکراتی ہے۔ اور چاندنی سیلِ رواں بن کر بہتی ہے اور افق سے افق تک کسی کے ذہن میں ستاروں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ اور محبّت کی آغوش وا ہو جاتی ہے۔ اور کوئی اطمینان کی گہری ٹھنڈی سانس لے کر اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔

ہاں ایک رات اور دوسری رات میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا نیکی اور بدی میں .....

لاجی گہری نیند سو رہی تھی۔ نیند میں اس کا چہرہ گوند والی ٹیپ کی صلیبوں سے پٹا ہوا چہرہ ایک مہیب قبرستان معلوم ہو رہا تھا۔

گل آہستہ سے بستر سے اٹھا اور باہر بالکونی میں آگیا...

رات خاموش تھی اور سیاہ، کہیں چاند تھا نہ کوئی تارا، سیاہ بادلوں نے سارے آسمان کو اپنے تاریک غلاف میں ڈھانپ لیا تھا۔ گل نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر وہ آسمان سے کسی طرح کی مدد کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

گل نے مایوس ہو کر اپنے دل کو ٹٹولا اور اُسے جذبے سے خالی پایا۔ محبت کی ساری ریت بہہ گئی تھی اور اس کے دل کی مٹھی بالکل خالی ہو گئی تھی۔

وہ لاکھ اپنے دل کو سمجھاتا، مگر جب لاچی کی طرف دیکھتا، اسے ایک کراہت آمیز متلی کا احساس ہونے لگتا یہ وہ لاچی نہیں ہے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جس کی خاطر اس نے ساری دنیا سے لڑائی مول لی تھی۔

جس کیلئے اس نے ملک اور کلچر، تہذیب اور عقل و دانش کی ساری دیواریں پھلانگ لی تھیں۔

وہ لاچی آج اس کی آغوش میں تھی لیکن وہ اس سے پیار نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے اپنے بازوؤں میں لپٹا نہیں سکتا تھا۔ اس کا وہ اعلیٰ وارفع، قلب وجگر کو گرمانیوالا سانس روک دینے والا شدید جذبہ آج کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چاروں طرف برف تھی۔ برف ہی برف، جس جذبے کو ٹٹولو یخ بستہ، جس آرزو کو دیکھو برفیلی، جس شوق کو چھوؤ خاکستر۔

حالانکہ یہ وہی لاچی تھی، وہی اس کا بلند جذبہ تھا وہی مکمل سپردگی اور اعتماد۔ اُسے گل کیا مل گیا تھا گویا کائنات

کی تمام خوشیاں اُسے حاصل ہوگئی تھیں۔

لیکن وہ خود ایک لق و دق صحرا میں اکیلا کھڑا تھا۔ اور چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنے جذبے کو آواز دیتا تھا۔ لیکن کہیں سے پلٹ کر محبت کا کوئی بھی جذبہ اُسے پکارتا نہ تھا۔

رات تاریک تھی!

جذبہ جامد!

مایوسی مکمل!!

گل نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی کسی لطیف جذبے کو اپنے پاس بلا نہ سکا۔

ڈاکٹر نے سات دن کے بعد لاچی کی پٹیاں کھول دیں۔

دس دن کے بعد لاچی چلنے پھرنے لگی تو لاچی سے گل نے کہا۔

"مجھے پونا میں ایک نوکری مل گئی ہے۔ مجھے وہاں جانا ہوگا"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

لاچی خوش ہو کر بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں پہلے جا کر حاضری دے آؤں۔ ایک مکان تمہارے لئے ڈھونڈ لوں۔ آخر ایک چھوٹا سا گھر

تو بسانا ہی ہوگا۔"

"ہائے میرا گھر !" لاجی خوشی سے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بولی۔

پھر ذرا اداس ہوکر بولی

"کتنے دن لگ جائیں گے ؟"

"تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔"

"اور ایک ماہ میں یہاں اکیلی رہوں گی ؟" لاجی نے گھبرا کے پوچھا۔ "نہیں میں تمہارے بغیر اتنے دن کیسے رہ سکوں گی ؟"

"بس ایک ہی ماہ کی تو بات ہے۔ ایک ماہ کے بعد میں بمبئی سے آکر لے جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی لے جاؤں۔ لینے کو تو ابھی ساتھ لیتا جاؤں۔ مگر میں تمہیں رکھوں گا کہاں۔ یہاں تو والد یہ گھر میرے قبضے میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے میں لوگوں سے بھی کہہ جاؤں گا۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ خط بھی ہر ہفتے لکھتا رہوں گا۔"

لاجی راضی ہوگئی۔ گل اس سے رخصت ہوکر چلا گیا۔ چلتے وقت اُسے پچاس روپے دے گیا اوپر کے خرچ کے لئے۔

لاچی بہت خوش تھی ......

ایک ہفتہ گزر گیا، دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔
مگر گل کا خط نہ آیا

ڈاکیہ آتا تھا اور لاچی کے کمرے کے سامنے سے گزر جاتا

لاچی ہر روز ڈاکئے سے پوچھتی اور ڈاکیہ ہر روز انکار میں جواب دیتا تھا۔ پھر بھی لاچی ہر روز اس سے پوچھتی تھی۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔

پھر اسیطرح دوسرا ہفتہ گزر گیا۔

نہ گل آیا نہ اس کا خط آیا۔

❖ ❖ ❖

لاچی نے پچاس روپے، بیحد سنبھال سنبھال کے خرچ کئے تھے۔ لیکن آخر پچاس ہی روپے تو تھے۔ دو مہینوں میں ختم ہو گئے۔ چار چھ دن اُدھار سے کام چلا۔ پھر لوگوں نے اُدھار دینا بھی بند کر دیا۔

اب تین روز سے لاچی کے ہاں فاقہ تھا۔ لوگ مسکراتے تھے۔ من چلے اس پر آوازے کستے تھے۔ "اندھی بیوقوف

گل کا انتظار کر رہی ہے۔ جی ہاں، وہ آئے گا، ضرور آئے گا، بھلا اُسے اس اندھی سے زیادہ خوبصورت لڑکی اس جہاں میں کہاں ملے گی؟"

لاچی سب کچھ سنتی، خاموش رہتی، اُسے اپنے گل پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے دل میں تاریک سے تاریک وسوسے اُٹھتے تھے۔

پھر بھی وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے گل کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور پورے اعتماد سے اپنے دل کو سمجھاتی۔ گل آئے ضرور آئے گا۔ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے۔

وہ بیمار پڑ گیا ہے یا اُسے نوکری نہیں ملی۔ مگر اس کو چاہیے تھا کہ مجھے خط تو لکھتا۔ دو سطر ہی کا خط لکھ دیتا۔ بس یہ خاموشی اچھی نہیں۔

ٹھیک دو ماہ دس روز کے بعد ڈاکئے کے قدم لاچی کے کمرے کے سامنے آ کے رُک گئے

اب چند دنوں سے لاچی نے پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی اور خلا میں گھورتی رہتی تھی۔

ڈاکئے نے بلند آواز میں کہا۔

"لاچی! تمہارا منی آرڈر ہے!"

ایک لمحے کیلئے تو جیسے لاچی کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ دوسرے لمحے میں وہ دوڑی دوڑی دروازے تک آئی۔ اور ڈاکئے سے ٹکراتی ٹکراتی بچی۔

"گل کا منی آرڈر ہے؟"

"ہاں!"

"کہاں سے آیا ہے؟"

"پونا سے۔"

"کتنے کا منی آرڈر ہے؟"

"تیس روپے کا!"

"اور کیا لکھا ہے؟"

"اور تو کچھ نہیں لکھا ہے۔"

"منی آرڈر کے نیچے والی جگہ میں دیکھو۔ ضرور کچھ لکھا ہوگا میرے لئے، کب آئے گا میرا گل؟ یا مجھے وہاں بلا رہا ہے؟ کچھ تو ضرور لکھا ہوگا سبحان! ذرا غور سے دیکھو؟"

سبحان ڈاکئے نے غور سے منی آرڈر کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔

" نہیں، اُس پر کچھ نہیں لکھا ہے لاچی ! "

لاچی چپ ہوگئی۔ چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا۔ پھر لاچی بولی۔

" اس منی آرڈر پر گل کا پتہ تو ہوگا ۔ ؟ "

" معرفت اسٹیشن ماسٹر پونا ۔ "

" یہ کیوں ؟ "

" جب کسی کا گھر نہ ہو۔ " سبحان بولا۔ " یا کوئی اپنے گھر کا پتہ نہ بتانا چاہے تو وہ آدمی اسیطرح منی آرڈر بھیجتا ہے "

٭ ٭ ٭

لاچی دیر تک خاموش رہی۔ اُس کا دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے ابھی اچھل کر باہر آجائے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

بہت مشکل سے اُس نے اپنی آواز کی لرزش کو قابو میں کیا۔ اور آہستہ سے بولی۔

" سبحان ! یہ منی آرڈر میرے لئے نہیں ہے۔ ایک

اندھی بھکارن کے لئے ہے۔ اِس لئے اس منی آرڈر کو واپس
کر دو!"

"لاچی میں جانتا ہوں۔ تم تین چار دن سے فاقہ
کر رہی ہو۔ اس منی آرڈر کو لے لو۔ لاچی! اس سے ایک
مہینہ تو کم از کم آرام سے گزر جائے گا۔"

"نہیں، سجان! لاچی نے بڑی سختی سے کہا۔
"اس منی آرڈر کو واپس کر دو۔ فوراً واپس کر دو۔"

یہ کہہ کر لاچی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا....
دروازے سے لگی لگی وہ بہت دیر تک سوچتی رہی
ڈاکئے کے قدم دور ہوتے گئے۔ جیسے ڈاکیہ نہیں، اس
کی اُمید کا آخری سایہ اس کے گل کی آخری پرچھائیں
اس کے اُفق سے دور، کہیں بہت دُور، پرے جا رہی
ہو۔ ہمیشہ کیلئے۔

آخری بار اس نے جھک کر اپنے محبوب کی
پرچھائیں کو سلام کیا۔

اور گو کمرہ تاریک تھا، اس کی آنکھیں اندھی تھیں
لیکن زندگی میں پہلی بار اُسے ہر شے صاف اور روشن نظر

آرہی تھی۔

ایسی صاف اور روشن جیسے رات کا اندھیرا۔

جیسے کائنات کا خلا، جیسے آدم کا گناہ .....

وہ ذرا جھجکی، جھک کر اس نے دیوار کے کونے کو ٹٹولا۔ اپنی پتلی لاٹھی اُٹھائی اور باہر کی نیم تاریک غلام گردش میں راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے دھیرے دھیرے بس کے اڈے پر بھیک مانگنے چلی گئی۔

ختم شد

کرشن چندر

کے لافانی قلم سے

چندا کی چاندنی	قیمت دس روپے
پیار کی خوشبو	" "
مِس نینی تال	" "
آئینے اکیلے ہیں	" پندرہ روپے
ایک عورت ہزار دیوانے	" "
زرگاؤں کی رانی	" چھ روپے پچھتر پیسے